اسلامی نظریۂ اجتماع

از

حیدر زمان صدیقی

ادارۂ اشاعت سرحد پشاور

قیمت مجلد:- تین روپے (سے)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اجتماعی اعمال کی بنیاد

(مولینا سید عبدالقدوس ہاشمی)

ہمہ گیر مذہب مذہب اگر واقعی مذہب ہے تو ضروری ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کے لئے ہدایات اور ضوابط موجود ہوں ورنہ حیات انسانی کی آرائش اور روح انسانی کی سکینت کا سامان اس سے مفقود ہوگا۔ مذہب کہیں تو رہنمائی کرے گا اور کہیں اپنے پیروں کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دے گا۔

خیال تو فرمایئے وہ بھی کوئی مذہب ہوا جس میں خالق و مخلوق کے رشتے بتا دیئے جائیں مگر یہ نہ بتایا جائے کہ مخلوق اور مخلوق میں باہمی تعلق کیا ہو۔ اور چھوڑ دیا جائے زندگی کے اتنے بڑے معاملہ کو رو مسو اور سولن کے عقلی گردون اور سرتی دسمرتی کے افسانوں کے لئے۔ ایسا طریقہ یا مسلک حقیقتہً کوئی مذہب نہیں بلکہ مذہب کی نقالی ہے۔

ذرا غور تو فرمایئے! آپ کو کس کس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے کسی ضابطہ

کی؟ جہاں آپ کو اپنے خالق کی یاد اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں ضرورت ہوتی ہے۔کسی ہادی برحق کی جو آپ کو بتلائے کہ پیدا کرنے والے خالق کو خوش کرنے اور اس کی خوشنودی سے اپنی اُخروی زندگی یا حیات ما بعد الممات کو خوشگوار بنانے کا یہ طریقہ ہے وہیں آپ اس کی بھی تو ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے تعلقات دوسرے انسانوں سے کیا ہوں اور کس طرح ان تعلقات کو بہتر رکھ کر آپ اپنی اُخروی زندگی کے لئے اس سے سرمایۂ سکون و اطمینان حاصل کریں۔اگر کوئی مذہب یہ نہ بتائے کہ آپ کے تعلقات پڑوسی سے کیا ہوں۔محلہ والوں سے کیا ہوں۔شہر والوں سے کیا ہوں اور خود اپنے خاندان والوں سے کیا ہوں تو یہ مذہب بے عمل صحرا نشین سادھوں کے کام کا تو ہو سکتا ہے لیکن ایک عملی انسان کو اس سے کیا ملے گا اور کون انسان ہوگا جس کے قلب کو ایسے مذہب سے اطمینان و سکون حاصل ہو سکے گا۔

دنیا میں ہمیں تو یہ صاف نظر آتا ہے کہ انسان اپنی طفلی کے ابتدائی دور میں بھی اپنی مرضعہ اور اپنی ماں سے مانوس ہوتا ہے۔اس کے بعد اپنے بھائی بہنوں سے اور پھر ہم عمر اور ہمجنسوں سے مانوس ہوتا ہے۔غرض یہ کہ آدمی مہد سے لحد تک اجتماعی زندگی ہی بسر کرتا ہے۔اب اگر مذہب ان مراحل پر اس کی رہنمائی نہ کرے تو کون ہے جو ان اجتماعی تعلقات کی ضابطہ بندی کرے گا۔اور اگر بفرض محال کوئی دانشمند ضابطہ بندی کر بھی دے تو پھر کون ذمہ دار ہے۔ان ضابطوں کی صحت اور ان کے مفید ہونے کا تجربہ اگرچہ بہت کچھ بتا دے پھر بھی حیات ما بعد الممات پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔اس کو قبر سے نکل کر کون تجربہ کار نہ

بتلائے گا۔

انسان مدنی بالطبع ہے وہ باہمدگر مل جُل کر ہی زندگی بسر کرتے ہیں لطف اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اکیلا انسان نہ ہنستا بھلا نہ روتا بھلا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی کثرت ایک وحدت مشترک میں گم ہو کر معاشرہ بناتی ہے اور معاشرے اپنی وسعت و ترقی میں ملّت و قوم بن جاتے ہیں۔

افراد کی انفرادی زندگی میں جہاں ایک نظم و ضبط ضروری ہے وہاں اس کی معاشرتی و ملّی زندگی میں بھی ایک ضابطہ اور بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لئے اللہ کے مذہب میں جو حقیقتہً ایک ہی مذہب ہے اور جس کے علاوہ سارے مذاہب کہلانے والے طریقے حقیقتہً نامکمل ڈھانچے یا مذہب کی نامکمل نقالی کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ جہاں انسان کی انفرادی و عائلی زندگی کے لئے بنیادیں بتائی گئی ہیں، وہاں اس کی ملّی و اجتماعی زندگی کے لئے بھی بنیاد اور اس میں نظم و ضبط قائم رکھنے کے لئے قواعد و ضوابط بنا دیئے گئے ہیں۔

یہ مذہب اسلام ہے۔ ان الدین عند اللہ الاسلام اور دین و مذہب تو صرف یہی ہے۔ اس سے پہلے کے تمام مذاہب اس کی تمہیدیں تھیں اور بعد کے مذاہب اسی کی دھندلی سی پرچھائیاں ہیں جو ناقص بھی ہیں اور شکستہ بھی۔

یقین و عمل اسلام نے انسان کے یقین اور اس کے اعمال کی بنیاد رکھی ہے۔ اس ناقابل انکار حقیقت پر کہ انسان خود بخود پیدا نہیں ہو گیا ہے بلکہ کسی ذی شعور و صاحب ادراک ہستی برتر نے اُسے پیدا کیا ہے

اور اس لئے انسانی اعمال و افکار محض اس کی رضا و اطاعت کے لئے ہونا ضروری ہے۔ انسان کی زندگی، انفرادی، عائلی اور اجتماعی تمام تر اسی مقصد و اصول کے ماتحت ہو تو صحیح ہے ورنہ غلط اور تمام تر غلط۔

ان صلوٰتی و نسکی و محیایٔ و مماتی للہ رب العلمین

انسان بولے تو اس کے لئے اور چپ رہے تو اس کے لئے۔ شادی کرے بچوں سے محبت کرے۔ پڑوسیوں کی امداد کرے یا ملّی و قومی فرائض کو ادا کرے تمام تر اسی مقصد و اسی منشا کے لئے۔

انسان اپنے اس ابتدائی دور سے جب کہ پہاڑوں کے غار اس کی آرام گاہیں تھیں اور جنگل کے پھل اور شکار اس کی غذائیں۔ اس دور تک جب کہ تہذیب و تمدّن کی فراوانی یتطاولون فی البنیان کا منظر پیش کر رہی ہے اور تکلّفات و تصنّعات کی بہتات نے الھٰکم التکاثر میں اُسے مبتلا کر دیا ہے۔

انسان انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف کیوں راغب ہے۔ کیا صرف اس لئے کہ کچھ ایسے مہم امور کی تکمیل کے لئے جسے کوئی انسان اکیلا انجام نہیں دے سکتا وہ چند یا بہت سے لوگوں کی مشترک توانائیاں ایک جگہ لگا دینا چاہتا ہے مثلاً کوئی شخص اکیلا ہی معمار، کسان، پارچہ باف، موچی اور ندافت وغیرہ سب کچھ نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی شخص اپنی انفرادی قوت سے سڑک، دواخانے، تعلیم گاہیں سب کچھ بنا کر تیار کر سکتا ہے۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ باہمی تعاون سے اجتماعی قوت پیدا کی جائے اور انسان یہ سب کچھ اپنے لئے مہیا کرے یا اس میں للہیت و بے غرضی بھی موجود ہے۔ ماں کی ممتا،

باپ کی محبت اور خدا کی رضا کا تصور بھی کہیں کام کرتا ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس اجتماع کی بنیاد کیا ہو۔ صرف "منافع" کا "اتحاد" اور کیا اس تصور میں اتنی قوت پیدا ہو جائے گی کہ انفرادی جذبات و عواطف کو ایک واحد کُل میں منضم کر دے۔ کیا یہی منافع کا تصور رقابت اور بالآخر ظلم و تعدی نہیں پیدا کر دے گا۔ ایک سپاہی کیوں نہ اپنی قوت سے باقی سارے اہلِ حرفہ کو اپنا غلام بنا ڈالے۔ اور کیوں نہ کسان لوگوں کو غذا کے لئے تڑپا تڑپا کر اپنی حکومت و آقائی منوالے اور اس کے بعد دوسروں کی توانائی سے فائدہ اٹھائے۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ یہی منافع کا خیال افراد تو افراد جماعتوں اور اقوام کو خود غرض بنائے ہوئے ہے۔ اور پوری انسانی آبادی انفرادی و جماعتی خود غرضی میں مبتلا ہو کر کراہ رہی ہے۔

متضاد عناصر کا اجتماع

اس طرح یہ بھی سوچئے کہ دو آدمی جب تک مقصد زندگی میں متفق نہ ہوں صالح اجتماع کس طرح پیدا ہو سکے گا۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک ملک میں کچھ لوگ تو رضاء خداوندی کے لئے عمل کرتے ہیں اور کچھ محض نفس پرستی اور ذاتی التذاذ و مسرت کے لئے کچھ خدائی قواعد کے پابند ہیں اور کچھ نفسانی اہواء و عواطف کے بہت سے ایسے ہیں جن کے نزدیک انسان ساری مخلوقات سے زیادہ قابلِ احترام ہے۔ اور بہت سے ایسے ہیں جن کے نزدیک گائے ساری مخلوقات سے زیادہ محترم ہے بلکہ مخلوقات سے برتر اسے پروردگار کا مقام حاصل ہے۔ بعض وہ ہیں جن کے نزدیک ساری کائنات انسان کے لئے ہے اور خود انسان حصولِ

رضائے خداوندی کے لئے۔ بعض وہ ہیں جن کے نزدیک انسان پیپل کے درختوں کی حفاظت کے لئے معرض وجود میں آیا ہے۔ اور سانپوں کو دودھ پلانا اس کا بہترین عمل ہے۔

ایسے متضاد عناصر سے جو اجتماع بنایا جائے گا فی الحقیقۃ وہ کوئی پائیدار اجتماع نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ دو ایسے متضاد متباین عقائد رکھنے والے اشخاص ایک ہی نسل کے ہوں۔ ایک ہی وطن میں زندگی بسر کرتے ہوں۔ ایک ہی زبان بولتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دنیاوی نفع اور استفادہ میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کریں لیکن مقصدِ زندگی کے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ تعاون نہ تو پائدار تعاون ہوگا اور نہ اس سے وہ عظیم الشان نتائج مرتب ہو سکیں گے جو اجتماع افراد انسانی سے مقصود ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسانی آبادی کے لئے بنیاد اجتماع افکار و عقائد کے اتحاد کو قرار دیا۔ تاکہ وہ اعمال جو کوئی فرد انفرادی طور پر انجام نہیں دے سکتا اجتماعی طور پر انجام دیئے جائیں اور ان کے انجام دینے میں ہر فرد کا مقصد انفرادی ایک دوسرے کے متخالف نہ ہو۔

مثال کے طور پر جنگ کو لیجئے۔ جنگ زمین گیری کے لئے بھی ہوتی ہے معاشی دستبرد کے لئے بھی۔ امن یعنی خدا کی برتری قائم کرنے کے لئے بھی ہوتی ہے اور اپنی بڑائی و برتری کا سکہ بٹھانے کے لئے بھی۔ اسلام نے بھی جنگ کی اجازت دی ہے اور اجازت کیا دی ہے جہاد فی سبیل اللہ کو تو فرض قرار دیا ہے۔ اور صرف اللہ اعلیٰ واجل کی رضا جوئی کے لئے فرض قرار دیا ہے۔ لیکن مقاصد کے

اختلاف سے اعمال اور نتائج کس قدر مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس طرح لگائیے۔

پہلی صورت ایک ملک کی فوج دوسرے ملک پر چڑھائی کے لئے روانہ ہوتی ہے۔ دشمن کے ملک کا تو ذکر ہی کیا' خود اپنے ملک کے جن علاقوں سے یہ فوج گزرتی ہے وہاں کی کھیتیاں ویران' باغ تاراج' لوگ دہشت زدہ اور سہمگیں اور فوج کے گزر جانے کے بعد اس حصۂ زمین پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک قیامت گزر گئی۔ سپاہی انسانی حقوق کا مطلق خیال نہیں کرتے باغوں کی ویرانی کا انہیں ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ ان کے مقصد جنگ کو ان تباہ کاریوں سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور نہ ان کی تنخواہوں میں اس سے کوئی کمی پڑتی ہے۔ ان کی بہادری و شجاعت کے تمغے اس سے کم نہیں ہو جاتے۔ اس لئے انہیں اس قسم کے اعمال سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

دوسری صورت مجاہدین کا ایک لشکر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ دشمن کے ملک میں داخل ہوتا ہے۔ ہری بھری کھیتیوں سے بچ کر نکلتا ہے کہ مبادا یہ پیروں سے کچل کر خراب نہ ہو جائیں پھل دار درختوں کے باغ سامنے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی مجاہد کا ہاتھ ان کی طرف نہیں اٹھتا۔ محاربین سے جنگ ہوتی ہے اور پوری شدت کے ساتھ ہوتی ہے لیکن غیر متحارب آبادی اطمینان کے ساتھ اپنے کام میں مشغول ہوتی ہے۔

ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ مجاہد اپنا گھربار' اپنی بیوی بچوں اور

اپنی کھیتی باڑی کو چھوڑ کر اس لئے جہاد میں آتا ہے کہ اس عمل سے خداوند تعالیٰ کی رضا اور اپنی حیات بعد الممات کے لئے سرمایہ جمع کرے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر اس نے کھیتیاں ویران کیں، اگر اس نے باغ تاراج کئے اور اگر اس نے بے گناہوں پر ہاتھ اُٹھایا تو خداوند تعالیٰ کی ناخوشی اور عتاب کا مستحق ہوگا اور اُسے ان اعمال کی سزا بعد الممات زندگی میں بھگتنی پڑے گی۔ وہ دیکھتا ہے کہ جس مقصد کے لئے اس نے جہاد کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اُن اعمال سے وہ مقصد ہی فوت ہوا جاتا ہے اور نہ صرف فوت ہوا جاتا ہے بلکہ اُلٹی وہ ابدی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس لئے لازماً وہ ایسے اعمال سے احتراز کرے گا۔

بالکل اسی طرح دوسرے تمام اجتماعی اعمال ہوتے ہیں، چاہے وہ رفاہی ہوں یا غیر رفاہی مسلمان چندے کر کے بھی شفاخانے بنواتے ہیں اور کافر بھی۔ لیکن دونوں کے مقاصد میں بڑا اختلاف ہوتا ہے اور اس کے نتائج ان شفاخانو میں قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں۔ کافروں کے اجتماعی کام شاندار، باقاعدہ اور باضابطہ تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہر جگہ دکھاوا، ہر جگہ ستائش کی تمنا۔ ایک کتاب الرائے، ایک چندے کا صندوق، عہدہ دارانہ شان، للہیت کا تصور مفقود، کسی برتر ہستی کی رضا کا خیال معدوم۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کے اجتماعی کاموں میں بدنظمی و بے قاعدگی سہی مگر اللہ کی رضا کے خیال کا اثر نمایاں ہوتا ہے اور صاف نظر آتا ہے کہ اس کام سے نہ قومی برتری ثابت کرنا مقصود ہے اور نہ لوگوں کو فریب نظر میں مبتلا کر کے خاص قسم کے عقائد پھیلانا مدِ نظر ہے۔

کافر کا نظریۂ اجتماع

غرض یہ کہ انسان فطرۃً اجتماع پسند ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ اس کی فطری خواہش کو ایسے انداز میں پورا ہونے کا موقع دیا جائے جو اس کی دنیاوی اور اخروی زندگی کے لئے مفید ثابت ہو سکے۔ تلاش کیجئے تو اجتماع کی بنیادیں دو قسم کی ملتی ہیں۔ صرف دنیاوی منافع مشترک کا تصور اور خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی جس میں منافع دنیاوی کو ایک ضمنی حیثیت حاصل ہو۔

کافرانہ تصور اجتماع میں صرف دنیاوی نفع مقصود ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے وطن، نسل، زبان، پیشہ، رنگ اور مشترک روایات قومی کو بنیاد اجتماع قرار دے رکھا ہے۔ اس طرح افراد انسانی ایک دوسرے سے مربوط ہو کر مختلف گروہوں میں تقسیم ہوئے اور الگ الگ جتھہ بندی وجود میں آتی ہے۔ پھر ان جتھوں میں اسی نفع کے تصور سے ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کو غلام بنانے کی سعی ہوتی ہے۔ مختلف دفاعی و ہجومی قومیتیں وجود میں آتی ہیں۔ تجارت کی منڈیوں اور کچے مال کی بہم آوری کے مواقع کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ جرمنی پولینڈ کے خلاف اعلان جنگ کر دیتا ہے۔ اور برطانیہ جرمنی کے خلاف۔ دنیا آگ کے شعلوں میں جھلسنے لگتی ہے۔ اور جوہری توانائی سے ملیامیٹ کی جاتی ہے۔ جرمنی تباہ ہو جاتا ہے۔ امریکہ اور روس میں رسہ کشی شروع ہوتی ہے۔ ایک اپنی معاشی دستبرد اور تجارتی گیرائی میں ساری دنیا کو پکڑ کر زیادہ سے زیادہ منافع اپنی قوم اور اپنے جتھہ کے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ دوسرا اپنا نظریہ لوگوں سے منوا کر اپنی سرداری کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔ منافع دنیاوی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ ان نتائج کے سوا اور کوئی دوسرا نتیجہ اُس اجتماع سے برآمد ہو سکتا ہے جس کی بنیاد محض دنیادی منافع کے اشتراک پر رکھی گئی ہو۔ یہ تو لازمی نتائج ہیں اس گمراہ یقین کے جس سے صرف حقوق کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور "فرائض" کا تصور دُور جا پڑتا ہے۔ للٰہیت کے بغیر فرائض کا تصور کیسے قائم رہ سکتا ہے؟ اور فرائض سے ذہنِ انسانی کو غافل کر کے محض حقوق کی طرف لگا دینے کا نتیجہ انفرادی و جماعتی خود غرضی کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔ خود غرضی سے آپ فساد فی الارض کے سوا کس چیز کی اُمید کر سکتے ہیں؟

اسلام کا نظریہ اجتماع

اسی لئے اسلام نے اجتماع نوعِ انسانی کی بنیاد صرف دنیاوی منافع مشترک کے تصور پر نہیں رکھی۔ تاکہ ذہن انسانی خود غرضیوں کے ناسور کا مقام نہ بن جائے اور حکم دیا کہ تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔ تعاون یقیناً ضروری ہے۔ انسان فطرۃً ایک دوسرے کا تعاون چاہتا ہے۔ لیکن اس تعاون کی بنیاد بھی بر و تقویٰ، خدا پرستی اور پرہیزگاری پر ہونی چاہئے۔ اثم و گناہ اور بے اعتدالی و بے راہ روی میں ہم وطن و ہم قوم تو کجا اپنے ماں باپ اور اپنے بیٹے کے ساتھ بھی تعاون نہیں کیا جا سکتا۔ افرادِ انسانی میں اجتماع کی بنیاد نہ نسل ہو سکتی ہے اور نہ وطن، نہ رنگ ہو سکتا ہے اور نہ زبان، نیکوکار اور بدکار کی دوستی نہیں، ظالم و عادل کا باہم جوڑ نہیں اور اچھے بُرے کا باہمی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔

اس طرح اسلام نے یقین و عقائد اور ذہن و دماغ کی یکسانی کو اجتماعِ انسانی

کی بنیاد قرار دیا اور بتا دیا کہ انسانوں کی صرف دو ہی قسمیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جس کے عقائد و اعمال کی بنیاد برو تقویٰ پر ہو ایسے انسانوں سے تعاون بھی کرنا چاہیئے اور ان کے ساتھ مل کر اجتماع کی تعمیر بھی ممکن ہے اور دوسری وہ قسم جس کے اعمال و عقائد کی بنیاد اثم و عدوان پر قائم ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان دونوں قسموں کے دو انسان ایک ہی وطن میں رہتے ہوں، ایک ہی زبان بولتے ہوں، ایک ہی رنگ و نسل کے ہوں، لیکن ان کے درمیان تعاون عمل کو خدا نے جائز نہیں رکھا کیونکہ مقصد عمل میں شدید اختلاف کے بعد عمل میں تعاون بے نتیجہ اور مضرت رساں ہو جاتا ہے۔

فساد کا اصلی سبب

موجودہ بے چینیوں اور ساری دنیا پر حاوی فساد کا اصلی سبب یہی ہے کہ خدا کی بجائے وطن کو معبود بنانے پر بد نصیب انسانوں نے بنیاد اجتماع ہی بدل دی ہے۔ باہمی تعاون کی بنیاد برو تقویٰ اور اس طرح رضاء خالق کی بجائے ایک بے جان بُت یعنی وطن کی سربلندی و بہبودی کے تصور پر قائم کر دی گئی ہے۔ اس لئے انفرادی خود غرضی کے تمام ناپاک و سفلی جذبات نے خوفناک وسعت پاکر قومی خود غرضی اور وطن پرستی کی شکل اختیار کر لی اتنی خوفناک شکل کہ اس کے مقابلہ میں برو تقویٰ اور نیکی و نیکوکاری کا انفرادی و اجتماعی تصور مردہ ہو گیا ہے اگر آج کوئی متقی اور نیکوکار شخص سچی بات کہہ دیتا ہے یا انسانیت سے محبت کی تلقین کرتا ہے تو وطن پرستوں کی بارگاہ سے اُسے "غدار وطن" کا لقب دیا جاتا ہے اور وطنی حکومت اُسے سزائے موت دیئے بغیر نہیں مانتی۔

ایمان سے سوچیے۔ آج انسان کی اجتماعی زندگی میں برتر مقام کسے حاصل ہے، اسی کمینے اور دون فطرت انسان کو جو وطن کے لئے ہر طرح کی قربانی و ایثار کے لئے بار بار اپنے آپ کو پیش کرتا رہا ہو۔ ایسے کمینہ اور ذلیل انسان سے بھلائی کی کیا اُمید کی جا سکتی ہے جو وطن کی سربلندی کے لئے بر و تقویٰ کے حدود کو توڑ سکتا ہے اور دوسرے انسانوں کو ذلیل کر سکتا ہے۔ اس سے کس مرحلہ میں آپ نیکی و نیکوکاری کی اُمید کر سکتے ہیں؟

تم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

یہ ایک بنیادی مسئلہ اور وقت کا سب سے اہم سوال ہے۔ یاد رکھئے کہ وطن کی سربلندی کا تصور اور نیکوکاری کا خیال دونوں ایک ہی سر اور ایک ہی دماغ میں قائم نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ہر شخص اس مسئلہ کو پوری طرح سمجھے۔ اللہ کی رضا کا یقین رکھکر اس کے لئے جد و جہد کرے اور تمام انسانی دماغوں کا اپریشن کرے جن میں وطن پرستی، نسل پرستی، رنگ پرستی غرض خدا پرستی کے سوا سب کچھ بھرا ہوا ہے۔ جب تک یہ سڑا ہوا اور متعفن مادہ خارج نہیں کیا جائے گا۔ اور موجودہ کا فرانہ اصطلاحات میں "غداران وطن" کی ایک خدا پرست اور صالح جماعت پیدا نہ ہو گی انسانیت کی موجودہ تکالیف کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔

مولانا حیدر زماں صاحب صدیقی کی یہ مختصر سی کتاب اس مقصد کے لئے ایک نہایت مفید کتاب ہے۔ طرز بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔ عبارت بھی

کچھ مشکل نہیں، اور باوجود اختصار کے مولانا نے دلنشیں انداز میں مسئلہ زیر بحث سے متعلق تقریباً وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کے کہنے کی ضرورت ہے۔ فجزاھم اللہ خیرا۔

عبدالقدوس ہاشمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

دنیا کے حالات جس تیزی سے بدل رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں اقوامِ عالم کی وطنی اور نسلی رقابتوں نے پوری دنیا کو اضطراب و بدامنی کے شعلوں کی لپیٹ میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور اب امن و خوشحالی کی اُمید، اُمیدِ موہوم ہو کے رہ گئی ہے۔ ان حالات میں مسلمان اور صرف مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اُٹھے اور مظلوم انسانیت کو اقوامِ غالبہ کے جبر و تشدد سے نجات دلائے۔ کیونکہ پوری کائنات میں صرف مسلمان ہی ایک ایسے نظریۂ اجتماع کا علمبردار ہے جو قبیلوی، نسلی اور وطنی قیود سے بالاتر اور انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات کا ضامن ہے۔

گذشتہ دو صدی سے اسلامی دنیا نے اقوامِ مغرب کے نظریہ ہائے قومیت و وطنیت کا شکار ہو کر ہمہ گیر اخوتِ اسلامی کو اپنے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور بین الاسلامی اتحاد (پان اسلامزم) کو ایسا دھکا لگا کہ آج تک ممالکِ اسلامی اغیار کے پنجۂ استبداد میں جکڑے ہوئے ہیں مگر اب

جب کہ اقوامِ یورپ کی رُوح اخلاقی قیود و اقدار سے بے نیازی، مادہ پرستی کے انہماک اور حرص زر و سیم کی وجہ سے بیکار ہو چکی ہے اور عالمِ انسانی ایک بہت بڑے انقلاب کے دروازے پر کھڑا ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمان اپنے اصلی مقام و موقف کی جانب بیتابانہ حرکت شروع کر دے۔

اگر او را مقامش باز بخشند

جمالِ او جلالِ بے پناہیست

اور اس ظالمانہ طبقاتی نظامِ اجتماع کو ختم کر کے قرآنی نظریۂ اجتماع و سیاست کے ذریعہ دنیا کو حرّیت و مساوات اور امن و فراغ کی برکات سے مالا مال کر دے۔

اس سلسلہ میں ضروری ہے کہ اسلام کے فلسفۂ اجتماع کے تمام اجزاء کو اصلی رنگ میں پیش کیا جائے تاکہ جو مسلمان فکرِ اسلامی کو چھوڑ کر فکرِ فرنگی اور فکرِ ہنود کی لعنت میں گرفتار ہو چکے ہیں وہ اپنے اصلی مقام کی طرف واپس آ جائیں اور غیر مسلموں کو اسلامی نظریۂ حیات کی عالمگیر افادیت کا یقین ہو جائے۔

یہ کتاب اسی کوشش کی دوسری کڑی ہے۔ یعنی "اسلامی نظریۂ سیاست" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے اور اس کے کچھ حصّے قسط وار "معارف" میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

دعا ہے کہ خدائے قدوس اس حقیر کوشش کو درجۂ قبول عطا فرمائے۔

صدر لقفی (پیٹھانکوٹ)

مقدمہ طبع ثانی

تصوّرِ اجتماع کے ارتقائی دور

یہ ایک عجیب بات ہے کہ عقلِ انسانی کی پیہم کاوشوں نے حفظِ انسانیت اور احترامِ آدمیت کے لئے جب بھی کسی نظریۂ زندگی کو سربراہ اور نگرانِ کار بنایا بالآخر وہی غارت گرِ انسانیت ثابت ہُوا۔ جس تصورِ حیات کو اخوتِ انسانی کا سب سے بڑا علمبردار سمجھا گیا وہی ایک مستقل وجہ عداوت و منافشت بن کے رہ گیا۔ اور جس داعیۂ اجتماع کو انسانی مرض کا چارہ ساز تصور کیا گیا وہی انسانیت کے لئے بلائے بے درمان بن گیا۔ اب بتائیے کہ عالمِ انسانیت کے بختِ سوختہ پر کیوں نہ ماتم کیا جائے کہ اس کی چارہ سازی کے لئے جو طبیب بھی آگے آتا ہے وہ اس کو کسی نئے درد میں مبتلا کر دیتا ہے اور پھر غور کیجئے کہ ایسی حالت میں اس کے علاج کے لئے کون سے دارالشفا کی طرف رجوع کیا جائے؟

در دستِ طبیب است علاجِ ہمہ دردے
دردے کہ طبیبم دہد آں را چہ علاجے

ہم جب پیچھے ہٹ کر انسانی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو صاف صاف نظر آتا ہے کہ کہیں رنگ و نسل اور قبیلہ و نسب کے بُت پر انسانیت کو بھینٹ چڑھا

جارہا ہے، کہیں مذہب (جو حقیقت میں سراپا اخوّت و محبّت کا پیامبر ہے) کے نام سے لاکھوں انسانوں کو خاک و خون میں تڑپایا جارہا ہے کہیں جغرافیائی قومیّت (نیشنلزم) کی ہلاکت آفرینیاں انسانی آبادیوں کو تہ و بالا کر رہی ہیں اور کہیں خود ساختہ فلسفۂ معیشت و سیاست کے آگے تمام انسانوں کو بنوک شمشیر جھکایا جا رہا ہے۔ اور علمبرداران حریّت و مساوات کی آتش انتقام کے شعلوں سے انسانی بستیاں جل کر بھسم ہو رہی ہیں اور آج ہم جس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں انسانیت کی ہمہ گیر خلش و بے چینی ہمیں اِس بات کے ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ؎

ہنوز اندر جہاں آدم غلام است
نظامش خام و کارش ناتمام است

انسانوں نے جب انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف رخ کیا تو سب سے پہلے ان میں نسلی شعور پیدا ہوا۔ یہ شعور دراصل انسانی ضرورتوں کی پیداوار تھا۔ اور ابتدا میں اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ زندگی کے مختلف شعبوں کی تکمیل کے لئے الگ الگ کارکن ہوں اور تقسیم کار کے طور پر کوئی ایک کام اپنے ذمہ لے لے اور کوئی دوسرا کام! اور اس طرح وہ ایک تمدنی ادارہ کی حیثیت سے تمدن کے مختلف شعبوں میں وسعت پیدا کریں۔ مگر چونکہ انسان کچھ فطرتاً طماع اور غرض پرست واقع ہوا ہے۔ اس لئے وہ آگے چل کر اس شعور کی روک تھام نہ کر سکا۔ اور اب یہ شعور مسابقت کے

میدان میں دوسری قومیتوں کو گرانے اور ان کے وسائل معیشت پر قبضہ کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

دنیا کی قدیم ترین اقوام مثلاً امم سامیہ اُولیٰ اور آرین اقوام کی فاتحانہ یلغاروں اور جنگجویانہ عزائم نے قیامت خیز زلزلہ کی صورت میں امصار و بلاد کو تہ و بالا کیا اور وہ انسانی لاشوں کو روندتی ہوئی دنیا کے بیشتر ممالک پر چھا گئیں۔ چنانچہ "من اشدّ منّا قوۃ" کے دہشت ناک قرآنی الفاظ سے ان کی قوت وشوکت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور زمانہ حال کے اثری اکتشافات نے ہزارہا سال پہلے کی انسانی تاریخ پر جہالت و گمنامی کے جو دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ بڑی حد تک اٹھا دیئے ہیں۔ اور آج ہم ان اقوام کی جنگی قوت و شوکت کے خط و خال تاریخ کی عینک سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن جہاں ان اقوام کے نظریہ اجتماع اور تصور زندگی کا تعلق ہے اس کی تحقیق و دریافت کے لئے بہرحال کتاب اللہ ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔

دراصل یہ قومیں بت پرست تھیں اور ان کا ذہنی شعور رنگ و نسل کے تنگ دائرہ سے آگے نہ بڑھا تھا۔ اور ان کو دوسری قوموں کے خلاف آمادۂ جنگ کرنے والا حقیقی محرک صرف ان کا نسلی غرور و تکبر ہی تھا۔ یعنی ان کی جنگیں مذہبی اور اصولی نہ تھیں، کیونکہ وہ کسی اصولِ زندگی کو تسلیم ہی نہیں کرتی تھیں، ان کی زندگی بے لگام تھی اور نسلی گھمنڈ نے ان کو انسانیت و اخلاق کے تمام تقاضوں سے منحرف کر دیا تھا۔

— مذہب اگر ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور مقدس اخلاقی اقدار کا حامل ہے

تو یہ اپنے ماننے والوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی قتل نفوس اور توہین آدمیت کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ مذہب کو اس کے ماننے والوں نے اس کی صحیح شکل میں مانا ہی کب ہے؟ پوری انسانی تاریخ میں بہت کم ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مذہب کو حقیقی طور پر دیکھا اور مانا گیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج مذہب دوسرے داعیاتِ اجتماع سے کچھ کم بدنام نہیں ہے

مذہبی تعصب کے لئے تاریخ کا وہ دور سب سے زیادہ بدنام ہے جس کو اہل تاریخ و تذکرہ نے قرون وسطی (مڈل ایجز) کا نام دیا ہے۔ اس دور میں مذہب کے نام سے انسانیت کی تذلیل و تحقیر کو اس درجہ فروغ رہا کہ اول الذکر دور کی بہیمیت و درندگی بھی اس کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے۔ چنانچہ اسلام کے ظہور سے کچھ عرصہ پہلے اہل ایران اور اہل روما کی جنگوں میں مذہبی دیوانگی نے اخلاق و شرافت کو جس طور رسوا کیا، انسانی نسلیں ہمیشہ اس پر نادم و شرمسار رہیں گی۔ اور عیسائی حکمرانوں نے یہودی آبادیوں پر جو مظالم ڈھائے اس کی مثال تاریخ کے صفحات میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے بلکہ خود عیسائیوں کا یعقوبی فرقہ بھی ان درندہ صفت حکمرانوں کے پیہم جبر و تشدد سے چیخ اٹھا۔ اور اس نے لوائے اسلام کے نیچے آکر پناہ لی

اس دور میں ایک طرف مذہب کے نام پر بادشاہوں کی ستم رانیوں نے مذہبیت کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات مشتعل کر دیئے تھے۔ اور دوسری طرف اہل کلیسا نے مذہب کو ایک ایسا مادۂ خام تصور کر رکھا تھا جو ان کی اغراض کے سانچے میں برابر ڈھلتا چلا جاتا تھا۔ دنیا کی ہر بدمعاشی

مذہب کا لباس پہن کر عین ثواب بن جاتی تھی۔ اور اہل کلیسا کی ہوس پرستیوں سے ایک دنیا چلا اٹھی تھی۔ چنانچہ بارہویں اور تیرہویں صدی تک برابر یہی حالت رہی۔ مگر یہ قدرت کا اٹل قانون ہے کہ جب کسی چیز کا بگاڑ حد سے تجاوز کر جاتا ہے۔ تو عین اسی وقت اس کے ردّعمل کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ اس زمانہ کے علمبرداران مذہب کی بدعنوانیوں اور ہوا پرستیوں سے دنیا اس قدر تنگ آگئی تھی کہ چودہویں صدی میں مذہب کے خلاف ایک طاقتور محاذ بن گیا۔ یہ اہل مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا دور ہے۔ جبکہ ایک طرف ملوکیّت و شاہی کو مٹانے کی جدوجہد کا آغاز ہوا اور دوسری طرف کلیسا و مذہب کی بدعنوانیوں کے رازہائے سربستہ منظرِ عام پر آنے لگے۔ یعنی انقلاب پسندوں کو یک لخت ان دو محاذوں پر لڑنا پڑا، مگر چونکہ ان کی طرف حریّت و مساوات اور قوم و وطن کے روح پرور اور دلنواز نعرے تھے۔ اور دوسری طرف جبر و تشدّد کی لرزہ انگیز روایات اور مذہب کے خود ساختہ اوہام و خرافات کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لئے بالآخر ملوکیّت کو شکست و ریخت سے دوچار ہونا پڑا اور کلیسا کی بہار بھی ختم ہوئی۔

یہ وہی دور ہے کہ امریکہ کو انگلستان کی محکومیّت سے گلو خلاصی ملی۔ پولینڈ روس کے خلاف نبرد آزما ہوا۔ اٹلی آسٹریلیا کے مدّمقابل اٹھ کھڑا ہوا اور بلقانی ریاستوں نے ترکِ شاہی کی غلامی سے نجات پائی۔ اور فرانس و انگلینڈ نے نظام ملوکیّت کو اپنے یہاں سے ملک بدر کیا اور اب ان ممالک میں کہیں کامل جمہوریّت (ڈیموکریسی) اور کہیں نیم جمہوری نظام

(پارلیمنٹری سسٹم) کا دور دورہ شروع ہوا۔ نیز مذہب کے خاتمہ سے جو خلاء پیدا ہو گئی تھی اس کو وطنیت کے عقیدہ سے پر کیا گیا۔ اور قوم و مملکت کی اساس اب وطنیت ہی قرار پائی۔

یہاں پہنچ کر انسان نے یقین کر لیا کہ اسے وہ نسخہ تریاق ہاتھ لگ گیا ہے۔ جس کے لئے انسانیت مدتوں سے مضطرب اور بستر مرگ پر کراہ رہی تھی اور اب یقیناً عالم انسانی کو امن و چین نصیب ہوگا۔ لیکن اس وقت بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا۔ کہ آج جس کو انسانی مرض کا علاج شافی تصور کر لیا گیا ہے۔ وہ دراصل حیات انسانی کے لئے سم قاتل ہے چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں عوامی طبقوں نے یہ محسوس کر لیا۔ کہ یہ حریت و مساوات کے دعوے اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ اور حقیقت میں انسانوں کی غالب اکثریت اب بھی اسی طرح مجبور و بے بس ہے۔ جس طرح پہلے تھی فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اللہ کی مخلوق ایک ہی بھیڑیئے کے لئے لقمۂ تر بنی ہوئی تھی۔ اور اب بھیڑیوں کی ایک منظم جماعت ہے۔ جو انسانوں کے گلہ کو پھاڑ پھاڑ کر کھا رہی ہے ؎

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے کہ آزادی کی ہے نیلم پری

اور پھر گزشتہ عالمگیر جنگوں میں وطن کی دیوی نے پوری دنیا کو جس طرح آگ و خون میں نہلایا اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر یہ نیشنلزم ہی تھا جس نے ہٹلر سے یہ کہلوایا کہ حکومت و قیادت کا حق صرف جرمن قوم کے لئے مخصوص ہے اور دنیا کی دوسری قومیں اس کی غلامی کرنے کے لئے

پیدا ہوئی ہیں یہی وہ پُرغرور نعرہ تھا جس نے پوری انسانی دنیا کو کئی سال جنگ کے جہنم کا ایندھن بنائے رکھا۔

بہرحال جب دنیا کے عوامی طبقوں کو یہ معلوم ہو گیا۔ کہ مغربی جمہوریت دراصل ملوکیت و شاہی کا جدید اڈیشن ہے۔ اور اس میں پس ماندہ طبقوں کے لئے کوئی سامانِ راحت نہیں ہے۔ تو انہوں نے زندگی کا بالکل ایک نیا حل پیش کیا، نیا فلسفۂ زندگی ترتیب پایا اور بالکل نئے اصولوں کی بنیاد پر مزدوروں کی جماعت کو منظم کیا گیا۔ اِس جدید فلسفہ نے انسانوں کو دو الگ اور مستقل محاذوں میں تقسیم کر دیا، ایک طرف مزدور و کسان اور دوسری طرف زمیندار و سرمایہ دار چنانچہ پہلے کی طرح اب بھی انسانوں کو یقین ہو گیا کہ زندگی کے مسئلہ کا حل اس کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتا کہ مزدوروں کی طاقتور تنظیم سے سرمایہ دار کی قوت و شوکت کو شکست دے کر سیاسی اقتدار کی باگ ڈور مزدور کے ہاتھ میں دے دی جائے۔ لیکن یہاں بھی واقعات نے ثابت کر دیا کہ جس کو فرشتۂ رحمت سمجھ لیا گیا تھا۔ وہ دراصل اشتعال پذیر آتش انتقام ہے۔ جو آگے چل کر کرۂ ارضی کے امن و امان کو خاکستر بنانے والی ہے۔ اور جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ انسانیت کی بربادی و ہلاکت میں جو کچھ کسر باقی رہ گئی ہے۔ وہ اِس جدید فلسفۂ زندگی کے علمبرداروں ہی کے ہاتھوں پوری ہو گی۔

ان نظریہ ہائے اجتماع کی ناکامی کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل کے لئے انسانوں کو آج کون سی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ جو راہیں ہلاکت آفریں

ثابت ہو چکی ہیں۔ ان پر ہی چلتے رہنا سراسر حماقت ہے۔ اس لئے اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم کسی ایسے تصوّرِ اجتماع کا سراغ لگائیں جو انسان اور انسان کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہ کرتا ہو۔ یعنی دو انسانوں میں رنگ ونسل یا بعدِ مسافت کے پردے حائل کرنے والا نہ ہو۔ بلکہ مشرق ومغرب کے انسانوں کو ایک ہی رشتۂ اخوت میں منسلک کرتا ہو

غنیمت ہے کہ دورِ حاضر کے بہت سے مفکّرین کو صدہا ٹھوکریں کھانے کے بعد ہوش آنے لگی ہے۔ اور اب وہ اِس بات کو محسوس کرنے لگے ہیں۔ کہ آج عالمِ انسانیت کے تمام مصائب اقوامِ حاضرہ کے تنگدلانہ تصوّرِ اجتماع یعنی نیشنلزم اور کمیونزم کی پیداوار ہیں اور انسان کو حقیقی امن اس وقت ہی میسّر آئے گا جبکہ ہمہ گیر اصولِ انسانیت اور کائنات کے محکم اور غیر متزلزل حقائق کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی تنظیم کی جائے گی۔ لیکن ابھی ان کو یہ فیصلہ کرنا ہے۔ کہ اس قسم کا ہمہ گیر عالمی تصورِ زندگی کہاں سے دستیاب ہو سکتا ہے؟ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ اور ٹھوکریں کھانے کے بعد ان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہو جائے گی کہ اِس ظلمت کدۂ یاس ونومیدی میں اگر کہیں امید کی کرن دکھائی دیتی ہے۔ تو وہ صرف اُسی اعلانِ حریت ومساوات کے اندر ہے جو آج سے تیرہ سو سال پہلے بُوقبیس کی پہاڑیوں سے بلند ہوا تھا۔ اور اس وقت ان کو بادلِ ناخواستہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ؎

لَیس لَنا اِلَّا اِلیکَ فِرارُنا۔ وَاَیْنَ فِرارُ النّاسِ اِلّا اِلی الرُّسُل

پیش نظر کتاب میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اسلام کے ہمہ گیر اور جہانی نظریۂ اجتماع کی حقیقت اور اس کے اجزاء ترکیبی سے بحث کی گئی ہے پہلی دفعہ یہ کتاب اگست ۱۹۴۷ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوئی تھی، یہ زمانہ وہ تھا جبکہ غلام ہندوستان دو آزاد مملکتوں میں تقسیم ہو رہا تھا۔ اور ملک کے کونے کونے میں فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی، قومیت کا نشہ انسانی دماغ پر اس طرح مسلّط تھا کہ کسی کو نیک و بد اور خیر و شر کے امتیاز کی سُوجھ بُوجھ ہی نہ تھی، وحشت و بہیمیت اور قساوتِ قلبی کے جو خوفناک مناظر اس زمانہ میں دیکھے گئے ہیں ان کی مثال پہلے کی انسانی تاریخ میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتی۔ لیکن آج جبکہ دلوں کا بوجھ بڑی حد تک ہلکا ہو چکا ہے۔ اور دماغ قومی و مذہبی جنون کی گرفت سے کچھ آزاد ہوتا جا رہا ہے یہ کتاب جدید اور کار آمد اضافوں کے ساتھ دوبارہ شائع ہو رہی ہے۔ دُعا ہے کہ خدائے قدوس اس کے پڑھنے والوں کو اسلامی وسعتِ نظر اور احترامِ آدمیت کا پاکیزہ ذوق عطا فرمائے اور پاکستانی مسلمان وہ مقدس انقلاب بپا کرنے میں کامیاب ہو جو اسلام کا مطمحِ نظر ہے اور جس کے لئے پاکستان کا خطہ حاصل کیا گیا ہے

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ

احقر الناس **حکیم حبیب زمان** (صدیقی)

ہری پور ہزارہ

۱۸ مارچ ۱۹۵۱ء

اجتماعیّت کا قرآنی تصوّر

کائنات ہستی فطرت کی عجوبہ زاویوں اور جدت طرازیوں کی آماجگاہ ہے اور اور اس جہان رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین و پُر کشش واقع ہوئی ہے کہ اس میں نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتیں ابھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہاں تاب ہے۔ جو پوری کائنات کو اپنے جلو میں سے لئے ہوئے ہے صحن گلشن کا حسین منظر ہو یا لق و دق صحرا کی تا بحد نظر وسعت شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلیں ہوں یا دشت وحشت خیز کی خاموشی اور پر سکون خلوتیں، صبح حیات کی ضیا پاش مسکراہٹیں ہوں یا شام زندگی کے ماتمی چہرہ کی وحشت ناکیاں۔ آبشاروں کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑک، بزم طرب و شادی کے نغمہ ہائے مسرت ہوں یا مجلس تعزیت کی دلفگار آہیں، یہ سب کچھ دل خود آگاہ و حقیقت شناس کی نظر میں ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیاں ہیں۔ اور ایک ہی نور مطلق پر ان کی انتہا ہوتی ہے۔

و فی الارض آیات للموقنین و فی انفسکم افلا تبصرون (الذاریات)	زمین میں اور خود تمہارے نفسوں میں اہل یقین کے لئے نشانیاں ہیں کیا تم ان کو دیکھتے نہیں ہو؟

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (ق)	بلا شبہ اس میں نصیحت و عبرت ہے۔ اس کے لئے جو پہلو میں حساس دل رکھتا ہے یا ہمہ تن متوجہ ہوکر کان لگاتا ہے

ارض و سما کی یہ کائنات جو روزمرّہ ہمارے مشاہدہ میں آتی ہے۔ اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہے۔ اور اپنے اعمال و وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیاء عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے۔ مگر پردۂ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر چہرۂ حقیقت پر نگاہ ڈالیئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاق گیر نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے۔ اور ہر وجود مشخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزء لاینفک ہے۔ عالم لاہوتی ہو یا کائنات ناسوتی، محفل انجم ہو یا جہان نباتات ارضی، نظام سحاب و باد و باران ہو یا سلسلۂ کوہ و بیابان غرض اس کائنات کی ہر چیز ہمہ گیر نظام عالم کی ایک کڑی ہے یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہے۔ جس کا وجود و بقا کارخانہ کے وجود و بقا پر موقوف ہے۔

قرآن حکیم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور ان کی اجتماعی تاثیر و افادیت میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ عالم بالا عالم جو اور ہمارے جہان رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیا کے معنوی اور افادی تعلق و ربط کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ بیشتر مقامات میں قرآن خود ہی اشیأ عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان میں ذکر کرتا ہے۔

الم تر الی ربک کیف مد الظل ولو شاءَ لجعله ساکناً ثم جعلنا الشمس علیه دلیلاً ثم قبضنٰه الینا قبضاً یسیراً وھو الذی جعل لکم الیل لباساً والنوم سباتاً وّ جعل النھار نشوراً وھو الذی ارسلَ الریحَ بشراً بین یدَی رحمته وانزلنا من السماءِ ماءً طهوراً لنحی به بلدةً میتاً ونسقیه مما خلقنا انعاماً وّاناسیَّ کثیراً (سورہ الفرقان)

کیا آپ نے اپنے پروردگار کی طرف نہیں دیکھا کہ اس نے سایہ کو کیسے پھیلایا اگر وہ چاہتا تو اس کو ٹھہرا دیتا۔ پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی جانب کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمہارے لئے رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا۔ اور اس نے زمین کے اندر پھیل جانے کے لئے دن بنایا۔ وہی ذاتِ خداوندی ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی ہیں۔ اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اتارا، تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیوں کو آباد کریں، اور پلائیں ہم یہ پانی اپنی مخلوق میں سے چارپایوں اور بہت سے لوگوں کو!

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُزْجِیْ سَحَابًا ثُمَّ یُؤَلِّفُ بَیْنَہٗ ثُمَّ یَجْعَلُہٗ

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالے چلاتا ہے بادلوں کو، پھر ان کو جمع کرتا

وَ يُمَا مَا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ وَ يُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَصْرِفُهٗ عَنْ مَّنْ يَّشَآءُ يَكَادُ سَنَا بَرْقِهٖ يَذْهَبُ بِالْاَبْصَارِ

(النور)

ہے، پھر ان کو تہ بہ تہ رکھتا ہے۔ پس تم دیکھتے ہو کہ ان کے اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑوں کی بلندی کی جانب سے برف (جو فضا میں ہوائے سرد سے منجمد ہوتی ہے) اتارتا ہے پس یہ برف جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے اور جس سے چاہتا ہے پھیر لیتا ہے قریب ہے کہ بجلی (جو بادلوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی کی چمک آنکھوں کی روشنی کو اڑا لے جائے

عالم ارض و سما کے اس وسیع تر نظام افادہ و اشتراک اور اس کے حسین وجمیل مناظر میں اہل بینش کے لئے جو وجہ کشش اور سامان عبرت بن سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے۔ آپ چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذرّہ سے لے کر پہاڑ تک آبِ جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمانوں کی بلندی تک، عالم نباتات سے لے کر جہان مہ و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے۔ گویا وہ کیف ومستی کے عالم میں مستانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے

وابرح مایکون الشوق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے۔ کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے یا زیادہ سے زیادہ دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے۔ جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے اور عصر رواں کے کچھ حواس باختہ اور زنگ نظر حضرات اسلام کو نازیت اور فیسزم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملّی قوانین کا منشور تصور کرتے ہیں۔ لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے۔ ایک ہمہ گیر نظام اطاعت ہے۔ کائناتی دستور حیات ہے اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے۔

افغیر دین اللہ یبغون و لہ اسلم من فی السمٰوٰت والارض طوعًا و کرھًا و الیہ یرجعون (آل عمران)	کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی دوسرا دین تلاش کرتے ہیں ؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت گذار ہیں اور اُن کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

دراصل اسی نظام اطاعت اور سر رشتۂ اجتماعیت سے اِس عالم

کا بناؤ سنگار اور حسن بہار آفریں قائم ہے۔ بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے۔ اور جو چیز اس آفاق گیر نظام سے کٹ جائے گی اس کا انجام بہرحال خسرانی و نامرادی ہے

و من یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منه و هو فی الاخرة من الخسرین (آل عمران)

جو شخص اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کی تلاش کرے گا۔ تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔

بلکہ اس چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے۔ لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا، پاؤں کی رگڑ سے ذرہائے خاک میں تحلیل ہُوا یا ہوائے تند و تیز اس کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی۔ دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے کمک حاصل کرتی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود کو ہرگز باقی نہیں رکھ سکتی۔

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ دستور اور نظام اطاعت ہے۔ اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہان کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف کار ہے۔

خلافت آدم کا مفہوم

نوع انسانی اس عظیم الشّان کارخانہ قدرت کا ایک فعّال اور موثر عنصر ہے۔ عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامے، ایجاد و تخلیق کی نو بہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بُو کے رنگا رنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجودِ موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں۔ اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگ بھیانک اور وحشت انگیز ہوتی، آخر یہ حضرتِ انسان ہی تو ہے جس کی پیدائش پر دیارِ عشق میں ہنگامۂ شور اٹھا، جہانِ حسن میں تہلکہ بپا ہوا اور فطرت نے ممکناتِ وجود کی تمام راہیں اس کے لئے وا کر دیں۔

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور
خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے۔ لیکن خود انسان کیا ہے۔ اور عالم امکان میں اس کا مقام کیا ہے؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع کی حقیقت خود بخود ہی وا شگاف ہو کر سامنے آجائے گی

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا۔ جو اپنی طبعی اور فطری قوتِ تخلیق سے انواع کائنات میں تصرف کر سکے۔ اس کا آہنی عزم ویرانوں کو آباد کرے۔ دریاؤں سے نہریں نکال کر

خشک زمینوں کو شاداب کرے۔ سورج کی تمازت سے دھکتے ہوئے دشت وصحرا کو کشتِ گل و لالہ میں تبدیل کرے۔ خوش منظر اور بارونق شہروں کی بنا ڈالے۔ اور اس کا علمی اور تحقیقی جوہر اشیاء کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے موالید و عناصر کی مدد سے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے۔ سمندر کی تلاطم خیزیوں کو مسخر کرے۔ ہوا پر اپنا تسلط جمائے۔ یہاں تک کہ ارض وسماء کی ناپیدا کنار وسعتیں اس کے لئے سمٹ جائیں۔ اور وہ اپنے علم و عمل سے کائنات پر حکمرانی کرے۔ اسرار فطرت کی آگہی کے ساتھ عالم وجود کی ہر شئے کو منشاء قدرت کے مطابق کام میں لائے۔ اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد کا باعث ہو بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی میں پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو۔ اور کوہ و بیابان اس کی بہار آفرینیوں سے مہک اٹھیں۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم
سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

حاصل یہ ہے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے اور اس کے ارتقا کے لئے کچھ طبعی اور فطری قوانین بنا دیئے ہیں تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی

وجودِ تشخص کی حفاظت وصیانت میں مصروفِ کار رہیں۔ لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانۂ فطرت میں حسن و دلکشی پیدا کرنے، ان کو خلّاقِ عالم کے منشا و مرضی کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور بااراده ہستی کی ضرورت تھی اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسان کو پیدا کیا، لہٰذا انسان کا مقصدِ حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرارِ فطرت کی ٹوہ لگائے اور حقائقِ کائنات کی طلب وجستجو میں اپنی علمی اور عملی قوتیں صرف کرے۔ بلکہ اس کا حقیقی مقصدِ وجود یہ ہے۔ کہ وہ اسرارِ فطرت کی دریافت اور حقایقِ کائنات کے انکشاف سے اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیاء عالم اور قوانینِ فطرت میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی رونما ہو، اپنے لئے ان اشیا کو زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنائے اور ایک طے شدہ سکیم کے تحت اپنے علم وعمل کو کام میں لائے۔

لہٰذا خلافتِ آدم کے معنی یہ ہوئے کہ خدائے قدوس نے انسان کو یہ حق دیا ہے۔ کہ وہ اپنے شعور وارادہ اور قوائے علم وعمل سے کائنات میں تصرف کرے اور پیدائشی طور پر یہ حقِ مطلق انسان کو حاصل ہے۔ کسی خاص گروہ انسانی سے مخصوص نہیں ہے، لیکن یہ مسلم ہے۔ کہ قدرت کے اس کارخانہ میں حق یونہی مفت تقسیم نہیں ہؤا کرتا بلکہ اس کے لئے خاص قسم کے صلاحیت شرط ہؤا کرتی ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا نے ہر انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے۔ اور زیادہ سے زیادہ دولت کمائے لیکن

بہت لوگ اس "حق" کے لئے مناسب تگ و دو نہیں کرتے۔ اس لئے وہ اس حق سے محروم رہتے ہیں بالکل یہی حال خلافت کا ہے کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہیں تمام انسانوں کے لئے واکر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کو علم و عمل کی صلاحیتوں سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے ایک مقام پر ذکرِ خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے۔

وعلم آدم الاسماء کلھا (بقرہ) — خدا نے آدم کو حقایق اشیا کا علم دیا۔

اور دوسری جگہ خلافت کو عمل سے مشروط کیا ہے۔

ثم جعلنٰکم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعملون (سورۂ یونس) — پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا، تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو

زمانۂ حال کے خود ساختہ شارحینِ اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت و اقتدار کی مرادف ہے۔ اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ ان کی انتہائی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک اعلےٰ و برتر مقامِ بندگی ہے۔ شرفِ انسانیت کی معراج ہے۔ علم و عمل اور فضائلِ اخلاق کی وہ پاکیزہ تر منزل ہے جو عصرِ حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ یعنی خلافتِ آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتداءِ آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے۔ کہ وہ خدائی صفاتِ کاملہ کا مظہرِ اتم بن کر کائناتِ ارضی کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشاء

خداوندی کے مطابق چلائے۔

نائبِ حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائبِ حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ اُو ظلِ اسمِ اعظم است
از رموزِ جزو کل آگاہ بود
در جہاں قائم بامراللہ بود
نوعِ انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است
از جلالِ او نجاتِ عالم است
زندگی را می کند تفسیرِ نَو
می دہد ایں خواب را تعبیرِ نو
(اقبالؒ)

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنے اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اُس طرح سے انجام دے جس طرح اس کے منوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے۔ اور اس ہدایت نامہ سے سرِمو بھی انحراف نہ کرے۔ اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہے تو اصولاً وہ اپنے منصب نیابت کا اہل نہیں رہتا۔ کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور شرط کا انتفا مشروط

کے انتفاء کو مستلزم ہے۔ لہٰذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے یعنی جس گروہ کو خلافت حاصل ہو گی حکومت و اقتدار کی مسند بھی اسے حاصل ہو گی، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو وہ منصب خلافت سے بھی سرفراز ہو۔ گویا خلافت ایک جلیل القدر مقام حریت ہے۔ جو اس عالم چار سو میں نہیں سما سکتا۔ بلکہ وہ سپہر نیلگوں اور جہانِ انفس و آفاق کو محیط ہے۔

نکتہ می گویمت روشن چو دُر
تا شناسی امتیاز عبد و حر
عبد گردد یاوہ در لیل و نہار
در دل حر یاوہ گردد روزگار

آج اہل مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع اور حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی عالم انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پروفیسر جوڈ اور ہینڈی النسل فلسفی اسکونٹ سموئیل اور دیگر کئی علما و مفکرین نے بارہا اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے دوامی اور مستقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ لیکن جس حقیقت کو ہم "خلافت" کی مقدس اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر

تصورات پر مبنی ہے اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطۂ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کافی نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے۔ جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اس کی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت چیخ اٹھتی ہے۔ وہاں اس کا دامن عدل و انصاف وا ہو جاتا ہے اور جہاں فسق و معصیت کی دبا پھوٹتی ہے۔ وہاں وہ تقوی و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے۔ غرض خلافت کیا ہے سراپا خیر و برکت، سراسر عدل و مساوات، اور بہ ہمہ وجوہ اصلاح و تعمیر کی پیغام بر!

اجتماع انسانی کا قرآنی تصور

ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آنا چاہتے ہیں۔ کہ انسانی اجتماعیت کا حقیقی موقف کیا ہے۔ اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں۔ جو انسان کے علاوہ جہان ارض و سما میں ہر لمحہ جاری و ساری رہتے ہیں۔ اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں۔ لیکن ان کی خارجی اور عملی تشکیل کی ابتدا حضرت آدمؑ کی پیدائش سے ہوئی ہے۔ جبکہ ان کو پیدا کرنے کے بعد خلافت کے منصب سے نوازا گیا یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہونا سلسلۂ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے اور خلافت کا مفہوم ہی اس

خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کررہا ہے۔کیونکہ خلافت کا لفظ
انسانوں کی سیاسی، تمدنی اور اجتماعی ہیئیت وحدانی پر دلالت کرتا ہے
اس لئے یہ کہنا غلط ہے۔ کہ پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کا شعور ہی موجود
نہ تھا۔ وہ پہاڑ کے غاروں میں رہتا اور گھاس پھوس کھا کر گزارہ کرتا تھا
قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفہ فطرت ہے کا دعویٰ یہ ہے۔
کہ انسان اوّل ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتا دیئے گئے تھے اور
پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں وسعت پیدا ہوتی رہی
اور ان کی خارجی تشکیلات پھیلتی، بڑھتی اور بدلتی رہیں

غرض کہ قرآن حکیم کے نزدیک وحدت انسانیت یا اجتماعیت کی اساس
ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس اخلاقی نصب العین ہے۔ جو رای العین سے
ورا ء الوریٰ ہے۔ اور وہ اس تصور اجتماع کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی
تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اور یہی وہ تصور حیات ہے۔ جس سے انسان کو پہلے
دن ہی آگاہ کر دیا گیا تھا۔ لیکن جہاں تک مادی نظریہ ہائے اجتماع کا
تعلق ہے وہ انسانوں کی عقل خود بیں" کی جدت کوشیوں اور مفاد پرستیوں
کی پیداوار ہیں۔ اور سراسر غیر فطری ہیں' یعنی سطور بالا میں جس تصور اجتماع کا
ذکر ہوا ہے وہ دینی تصور اجتماع ہے۔ اور اس کی اساس عالمگیر اور
محیط کل اصول حیات ہیں جو کسی مخصوص نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص
نہیں رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماعیت قبیلہ و نسب اور
قوم و وطن کی حد بندی پر مبنی ہیں۔ اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے

نسلی طبقوں اور وطنی قومیتوں میں تقسیم کرنے والے ہیں۔
یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہے۔ کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے۔ اور اس کارگہِ عالم میں انسان کو زندگی کے مرحلۂ اوّل پر ہی اِس سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے۔ تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ اور پھر وہ جس قدر نشو و نما کے مرحلے طے کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے علائق میں توسیع پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقہ علائق میں جکڑا ہوا پاتا ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر اس کو گرد و پیش کے اجتماعی اور تمدنی تصورات سے سابقہ پڑتا ہے۔ اور وہ یا تو ایک ہمہ گیر رشتۂ اخوت دینی میں منسلک ہو جاتا ہے اور یا وہ محدود اور سطحی علائق کے تنگ دائرہ میں سمٹ کے رہ جاتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا۔ اور رفتہ رفتہ تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے نظر بنا لیا۔ اور یہاں تک پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہے۔ اور آج وطنی عصبیت نے اس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلّط جما لیا ہے کہ اس کی نظر میں انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا۔ ایک قوم دوسری قوم پر درندوں کی طرح پل پڑتی ہے۔ اِس کے گوشت سے خلاءِ شکم پُر کرتی، اس کی ہڈیوں سے اپنے مستقبل کی

سر بفلک عمارت تعمیر کرتی اور اس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے۔ غرض اس بُت ناارجمند کے ہاتھوں آج انسانیت بستر مرگ پر کراہ رہی ہے۔

فکر انساں بت پرستے بت گرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے
باز طرح آزری انداخت است
تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند
پیش پائے ایں بُت ناارجمند (اقبالؒ)

مغرب کی نشاۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ بنایا اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصور زندگی سے پر کیا جائے یعنی کوئی ایسا تصور زندگی ڈھونڈ نکالا جائے۔ جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقا کے لئے ایک قوی تر اور منضبط تر محرک کا کام دے سکے۔ لیکن اس دور کا انسانی ذہن گرد و پیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گزر رہا تھا۔ ان کے قدرتی اقتضا نے انسان کو تہذیب حاضر کے نوتراشیدہ بت (ملک و وطن) کے آگے سرنگوں کر دیا، یہ زمانہ اٹھارہویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا جبکہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ

اور مستقل تصوّر مملکت کی حیثیت سے منظر ظہور پر آئی اور اس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا۔ اس وقت سے لے کر آج تک وطنیت کا ہوس پرستانہ تصور اقوام حاضرہ کی سیاست و معیشت کی روح رواں ہے۔ اور وطنی قومیتوں کی سرفرازی کا مضبوط ترین محرک بنا ہوا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس نے انسانی قدروں کو جس طرح رسوا کیا ہے۔ اس کی چند مثالیں گذشتہ عالمگیر جنگوں اور تقسیم ہند کے بعد کی وحشتناکیوں میں دیکھی جا سکتی ہیں فعتبروا یااولی الابصار

ان فی ذالک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھیر	اس میں اس شخص کے لئے عبرت و موعظت کا سامان ہے۔ جو اپنے پہلو میں دل حساس رکھتا ہے۔ یا وہ پوری طرح متوجہ ہو کر بات سنتا ہے

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کے ریگ زاروں، بیابانوں، کہساروں، دریاؤں اور چمنستانوں میں اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے، لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ زمین کے کسی خطہ کو جو محض اس کی رہائش اور تمتع کے لئے بنایا گیا ہے۔ اپنا کعبہ مقصود بنالے آخر انسان کو اس لئے تو نہیں پیدا کیا گیا۔ کہ وہ زمین کی پستیوں میں اپنے آپ کو گم کر دے؟

حضرت اقبالؒ نے کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے:۔

باوطن اہلِ وطن را نسبتے است
زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر
نکتۂ بینی زِ مُو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلیہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں
تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

مملکت کا جدید تصور اس نئی وطنی شریعت میں قوم اور مملکت ایک ہی معنوں کے دو عنوان ہیں یعنی جب ایک ملک میں بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تو ان کی اس ہیئتِ اجتماعیہ کو مملکت کا نام دیا جاتا ہے۔ اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے۔ گویا مملکت ہو یا قوم اس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجود وطنیت کا تصور ہے۔ اور عہدِ حاضر میں افرادِ انسانی کے باہم اشتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت

اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ نہ ہو۔ ایک ملک کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہوں میں بٹے ہوئے ہوں لیکن اس لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطۂ ارضی میں اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہیں۔ ان کی اس ہیئت اجتماعیہ سیاسیہ کو مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ ان میں اتحاد وطن کا رشتہ موجود ہے اس لئے وہ ایک مستقل اور جداگانہ قوم ہیں، رہا عقیدۂ مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیویٹ زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور ان کی قومیت پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوتا۔ گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی درجہ دیتا ہے بلکہ اس کو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے ہنگاموں سے دور اور گھر یا عبادت گاہ کی چار دیواری میں محدود رکھنا چاہتا ہے اور جہاں تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے۔ وہ ایک با اقتدار اور معصوم سیاسی ادارہ ہے، جو بلا شرکت غیرے مقنن بھی ہے۔ اور اخلاقی قدروں کا خالق بھی ہے۔ اسکو کسی مذہب و ضابطۂ اخلاق کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ بذاتِ خود ایک دین و مذہب ہے، جس چیز کو یہ اچھی کہے وہ اچھی اور جس کو بری کہے وہ بری ہے ؎

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

دین و سیاست اور مذہب و ریاست کی تفریق جدید تصور قومیت و مملکت سے بہت پہلے سولھویں صدی میں منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ اور اس ابلیسانہ کارنامے کا سہرا مشہور ابلیس صفت فلسفی میکیاولی کے سر ہے۔ اس

شخص نے سب سے پہلے مملکت کو مذہب و اخلاق کی گرفت سے آزاد کیا
اور بالکل ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی یعنی اس نے بتایا کہ مقصود بالذات
مملکت کا عروج و ارتقا اور خوشحالی ہے۔ اس راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس
کو مٹا دینا چاہیئے۔ خواہ وہ مذہب و اخلاق ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں اگر مذہب و
اخلاق سے مملکت کی توسیع اور قوت و اقتدار کے حصول میں مدد مل سکتی ہو۔
تو محض اس غرض کے لئے مذہب کے نام سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔
لیکن یہ محض ایک فریب کارانہ نقطۂ نظر سے یا سیاسی حکمت عملی (پولیٹیکل سٹنٹ)
کے طور پر ہی ہونا چاہیئے۔ ورنہ مقصود بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے
بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بڑے سے بڑا جھوٹ
اور بڑی سے بڑی بداخلاقی بھی عین ثواب ہے جبکہ اس سے مملکت کو
کسی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو۔ اور جہاں کسی اخلاقی مقصد کی خاطر
مملکت کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو وہاں یہ اخلاقی مقصد اس کے
نزدیک سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو گناہ ہے۔

مغرب کی گھناؤنی فضا میں جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی
کارستانیوں؟ غرض پرستیوں اور اوہام طرازیوں سے سخت نالاں تھے اور کلیسا
و شاہی کے باہم تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش کا شکار رہتے۔ انہوں نے
میکیاولی کے اس نئے ذہن کو بہت آسانی سے قبول کر لیا۔ بالخصوص وقت
کے بادشاہوں نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا۔ اور کلیسا کا رہا سہا
اقتدار بھی ختم ہونے لگا۔ مگر کچھ زیادہ عرصہ گزرنے نہ پایا تھا۔ کہ مطلق

العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقوں کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت میں نمودار ہوا۔ اور اب مغرب کے انقلاب پسندوں نے ایک جدید سیاسی، جمہوری اور صنعتی انقلاب بپا کرنے کی ٹھان لی۔ بیشتر مغربی ممالک میں انقلابی تحریکیں اٹھیں۔ ہنگامے بپا ہوئے اور عوامی طبقوں اور حکمرانوں میں شدید تصادم ہوا۔ بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان بادشاہوں کو سرنگون ہونا پڑا۔ اور انہوں نے بپٹ پٹا کر مسندِ اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشاۃ جدید کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے۔ جبکہ مغرب میں جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتیں قائم ہوئیں اور قدیم مملکتی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریوں (تھیوریز) نے جنم لیا۔ چنانچہ وطنی "قومیت" اور مملکت کا جدید تصور اسی عہد کی پیداوار ہے۔ مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ انہوں نے ملک و وطن کی بنیادوں پر جدید "فلسفہ اجتماعی" کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر "رشتہ انسانیت" کو تار تار کر دیا۔ چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و مذہب بنا۔ ان کے جینے، مرنے صلح و جنگ اور تمام عمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد قرار پایا۔

یورپ از شمشیرِ خود بسمل فتاد
زیرِ گردوں رسمِ لادینی نہاد

یعنی جہاں تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے۔ اس میں میکیاولی کا تصور ہی کارفرما رہا۔ چنانچہ عہد جدید کے یورپ میں جو علماء مفکرین پیدا ہوئے

ان میں سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصوّر مملکت کو سراہا بلکہ ان کے جدید نظریوں نے اس کو اور زیادہ تقویت دی۔ اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا۔ چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا کہ اس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے۔ یعنی مملکت کسی چیز کی تابع نہیں ہے۔ اور باقی تمام چیزیں مملکت کی تابع ہیں

ہیگل کے تصوّر مملکت نے مذہب و اخلاق کی ذہنی برتری پر جو چوٹ لگائی تھی وہی کیا کم تھی کہ ڈارون کے نظریہ کائنات نے اس کے جسدِ نیم جاں پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب اور خدا کا تصوّر محض عجوبۂ روزگار یادگار بن کے رہ گیا۔ اور اس کے بعد اس جدید مملکتی تصور نے ایک ہمہ گیر نوعیت اختیار کر لی۔ چنانچہ کارل مارکس اور اینجلز جو دُنیا کے جدید خالق ملنے جاتے ہیں نے ہیگل اور ڈارون کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی۔ یعنی مارکس کا نظریۂ تاریخ دراصل ڈارون کے نظریہ ارتقا کا غماض ہے۔ اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگل کی جدلیت کی مسخ شدہ صورت ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمام تر دوسروں کے دماغی کارناموں سے استفادہ کر کے ایک عجیب و غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا۔ آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور کیا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا

گداگر ہے۔

بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر وہی ہے۔ جس کی ابتدا سولہویں صدی میں ہوئی تھی۔ لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ اور خدا و مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مذہب و خدا کا تصور محض دقیانوسی اور سرمایہ دارانہ ذہن کی اُپج ہے۔ جس کو عوامی طبقوں کی دولت و عزت کا شکار کرنے کے لئے بطور ہتھکنڈے کے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتا۔ بلکہ ہر لمحہ بدلنے والی چیز ہے۔ خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار ان کے نزدیک یہ ہے۔ کہ جو چیز اشتراکی مملکت و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو وہ خیر اور صواب ہے۔ اور جو اس کی تخریب و فساد کا باعث ہو وہ شر اور خطا ہے۔

لینن کہتا ہے۔ کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظام اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطرت طاقت کا بنا ہوا ہو۔ اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظام فکر و اخلاق سراسر فریب ہے۔ نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استیصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ میں ہر چیز اخلاقاً درست ہے۔ ہم جب سرمایہ دار طبقوں سے لڑیں گے تو اس جنگ میں جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہیں۔

غرض زمانہ حال کا جدید تصور مملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر

سے ترکیب پاتا ہے۔ ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہیں۔ وہ ان کو خلش و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس انتھاہ سمندر کی پہنایوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ جہاں سے ان کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہاں آفاق گیر اقدار حیات اور ہمہ گیر اصول انسانیت کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہاں احترام آدمیت کا مقدس جذبہ ناپید ہو، جہاں ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزاروں ناکردہ گناہ انسانوں کے خونِ ناحق سے ہولی کھیلی جا رہی ہو۔ جہاں وحشت و درندگی کو قابلِ فخر کارنامہ اور معصوم بچوں کو ان کی ماؤں کی گود سے چھین کر انتہائی بے دردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو۔ کیا وہاں انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسّر آسکتا ہے؟

حاصل یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزوں خلش اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانوں کی وحشت و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنا دیا ہے۔ کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوت انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں ہے۔

الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم اولٰئک لہم الامن وھم مہتدون (۱۱ انعام)	جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، ان کے لئے ہی امن کی زندگی ہے اور وہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔

ان ہمہ گیر اصولِ انسانیت کے سوا جو کچھ ہے وہ ظن و تخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے۔ اور اس سے کارِ حیات کی الجھنیں کبھی حل ہو ہی نہیں سکتیں۔ بلکہ اور زیادہ الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ان یتبعون الا الظن و ما تھوی الانفس ولقد جاءھم من ربھم الھدای

رہبرِ ما ظن و تخمیں تو زبوں کارِ حیات

شعورِ ذات کی تکمیل

اور

معاشری نشو و ارتقا

انسانیت کا مقام شرف

حیات انسانی کے شعبۂ عمل کا ہر زاویہ انسان کی فکری اور ذہنی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ بلکہ جولانِ طبع اور رفتارِ فکر کے ساتھ ساتھ زندگی کے عملی زاویے بھی متغیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور نقشۂ حیات کے خالی اور بے رنگ خانے بھی وارداتِ قلب کی رنگینیوں سے چمک اٹھتے ہیں۔ اور اس طرح فرد اور جماعت کے مستقبل کی تعمیر ہوتی ہے۔

یہ مسئلہ علم النفس (سائیکالوجی) کے مسلمات سے ہے کہ انسان کے قلب و جسد میں ایک نہایت گہرا اور پایدار تعلق ہے اور بیشتر جسمانی اعمال و وظائفِ نفسیاتِ ذہنی کے مظاہر ہیں۔ اور انسان کا ہر شعوری اور ارادی فعل اس کے نقوشِ قلب کے اجمال کا شارح ہے۔ بلکہ حرکاتِ جسم کا نقطۂ مرکز یہی چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ جس سے پورے جسم کا صلاح و فساد وابستہ ہے۔

الا انّ فی الجسد مضغۃً	ہاں! جسم انسانی میں گوشت کا ایک
اذا صلحت صلح الجسد	ٹکڑا ہے کہ اس کے صلاح سے سارا جسم
کلہ واذا فسدت فسد	صالح اور اس کے فساد سے سارا جسم فاسد
الجسد کلہ الا وھی القلب	ہو جاتا ہے وہ کیا ہے؟ دل!

(اخرجہ البخاری)

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مَر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

وہ چاہت اور محبت جس سے کون و مکاں کی ہر چیز زندگی کی پرکیف مسرتوں سے سرشار نظر آتی ہے۔ اسی نہاں خانہ دل میں قرار پکڑتی ہے۔ اور یہی وہ مرکز انوار ہے جس کی ضیا ریزیوں سے کائنات کا ذرہ ذرہ تابانی حاصل کر رہا ہے۔ اور حیاتِ انسانی کی بلند پروازیاں اسی طائر لاہوتی کے بال و پر کی رہین منت ہیں

تپش می کند زندہ تر زندگی را
تپش می دہد بال و پر زندگی را (اقبالؒ)

یہ کون نہیں جانتا؟ کہ انسان کے ظاہر و باطن میں ایک قسم کا برقی تعلق ہے۔ اور قلب کی برقی رَو جسم کے ہر حصّہ پر حاوی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خوشی کے وقت انسان کا چہرہ بشاشت و مسرت سے چمک اٹھتا ہے۔ اور اندوہ و غم سے ظاہر جسم پر غیر معمولی تکان اور بے چینی کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں، حالانکہ خوشی اور غم قلبی کیفیات ہیں

ہم جانتے ہیں کہ بھوک کا علاج غذا سے اور پیاس کا پانی سے ہوتا ہے۔ یہاں تک تو علم و یقین کا درجہ ہے۔ اب بھوک لگنے پر غذا اور پیاس کے وقت پانی کا استعمال فعلیت کا درجہ ہے۔ گویا مرتبہ فعلیت علم و یقین کی شعاعوں کا عکسِ اوّلین ہے۔

علم و یقین اور عمل میں بالکل وہی تعلق ہے۔ جو نور و ضیاء اور اشعۂ شمس میں ہے۔ جہاں سورج کی شعاعوں کی رسائی ممکن ہے وہاں حسب استعداد و صلاحیت روشنی کا پایا جانا لازمی ہے۔ اشعۂ منعکسہ کی قوت اور عکس پذیر اشیاء کی استعداد کے تناسب پر روشنی کی قوت و ضعف کا انحصار ہے۔ جب یہ شعاعیں کسی لطیف، شفاف اور چمکدار چیز پر پڑتی ہیں۔ تو وہاں حیرت انگیز چمک اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نمودار ہوتی ہے۔ اور اگر عکس پذیر چیز کے آگے غلیظ پردہ حایل ہو یا وہ خود کثیف اور سیاہ رنگ ہو تو وہاں بھی یہ شعاعیں اپنا اثر دکھاتی ہیں۔ مگر وہ روشنی (لایٹ) پیدا نہیں ہوتی۔

بالکل اسی طرح قلب کی برقی لہر کی قوت اور جسم کی صلاحیت و استعداد کے توافق اور توازن ہی سے حیاتِ شخصی اور حیاتِ اجتماعی کے نتائج وابستہ ہیں۔

کذالک تنشأ بینۃٌ ہو عرقہا
وحسن نباتِ الارض من کرم البذرِ

اس فعل و انفعال کا محل اول اگرچہ فرد ہے۔ لیکن حیاتِ ملی، فرد کی حیاتِ مشخصہ سے الگ نہیں۔ بلکہ قوم اور جماعت کی اجتماعی زندگی کا اصل ماخذ حیاتِ فرد ہی ہے۔ اس لئے جماعت کا وجود شخص کے وجود ہی کی ایک دوسری شکل ہے۔ اور جماعت کی ذہنی اور عملی استعداد درحقیقت افراد کی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔

یا یوں کہنا چاہیئے۔ کہ شخص اپنی انفرادی حیثیت میں اگرچہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ مگر جب تک اس کے کمالات شخصی جماعت سے انضمام پذیر نہ ہوں وہ خود بھی اپنے کمالات سے متمتع نہیں ہو سکتا اور نہ ہی اس کے ذاتی جوہر کی کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔ اس لئے فرد بہر حال اپنے کمال شخصی کی افادیت و اظہار میں جماعت کا محتاج ہے اور جماعت جس طرح اپنے وجود میں وجودِ فرد کی محتاج ہے۔ اسی طرح اس کے مقدر کی تابانی فرد کی شعاع ریزیوں کی رہین منت ہے ؂

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ قلب کی یہ پُراسرار قوت کس طرح درجۂ کمال کو پہنچتی ہے؟ اور کس طرح فرد کی تکمیل ذات کا ذریعہ بنتی ہے؟ درحقیقت اس روحانی قوت کی اصلاح و تربیت صرف ایک چیز سے ہوتی ہے۔ جسے قرآن حکیم اپنے حکیمانہ انداز میں "تقویٰ" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسی تقویٰ کو سعادت انسانی کا واحد ذریعہ قرار دیا ہے۔ اور یہی حیاتِ ملی کی واحد اساس ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الآیہ)

جو شخص تقویٰ سے متصف ہو گا۔ خداوند تعالیٰ اس کے لئے زندگی کی تمام شاہراہیں کھول دے گا۔ اور نامعلوم ذرائع سے اسکی ضرورتوں کی تکفیل کریگا

"تقویٰ" دراصل ایک قرآنی اصطلاح ہے۔ اور اس کا اطلاق قلب کی اس کیفیت پر ہوتا ہے جو انسان کو نوامیسِ فطرت کے احترام، اقدارِ شریعت کے اتباع اور حدود واحکام کی خلاف ورزی سے اجتناب پر آمادہ کرتی ہے اس کی موجودگی میں انسان کا کوئی قدم بے سوچے سمجھے نہیں اٹھ سکتا بلکہ قدم اٹھانے سے پہلے اُسے اپنے ضمیر، الٰہی دستورِ اخلاق، اور نوامیس شریعت سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے۔ کہ ان کے ظاہر و باطن پر تقویٰ کا رنگ نمایاں ہونا چاہیئے۔ یہاں تک کہ انسان کے لئے حقیقی لباس اسی تقویٰ کو قرار دیا گیا ہے۔

یَابَنِیٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی ذٰلِکَ خَیْرٌ	اے آدم کے بیٹو! ہم نے تمہارے لئے لباس اتارا جو تمہاری شرمگاہوں کو چھپاتا ہے اور تمہارے لئے زینت بھی ہے۔ لیکن یاد رکھو تقویٰ کا لباس ہی بہترین لباس ہے
(الانعام)	

اور عشق و محبت کی دور دراز منزلوں کو طے کرنے کے لئے زادِ سفر بھی یہی تقویٰ ہے

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی	زادِ راہ تیار کرو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے

نیز مقامِ رفعت تک اگر انسان کی رسائی ہوسکتی ہے تو صرف

اس تقویٰ کے سوا۔ اور کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کو کامیابی کی منزل تک پہنچا سکے

لَن يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِن يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ (سورۂ حج)	قربانی کے گوشت اور خون کو بارگاہ رب العزت تک رسائی نہیں ہو سکتی وہاں تک جو چیز پہنچ سکتی ہے وہ تقویٰ ہے

وادیٔ عشق اگر دور و دراز است و لے
طے شود جادۂ صد سالہ با ہے گاہے (اقبال)

اور یہی وہ قوت قاہرہ ہے جو فولادی قلعوں کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ اور تنہا غلبہ و تسلّط کی ضامن ہے۔ مراحلِ عشق کو طے کرنے اور زمین و آسمان کی وسعتوں پر چھا جانے کے لئے یہی پُراسرار طاقت کام آتی ہے

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (انفال)	اے ایمان والو۔ اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو خدائے ذوالجلال تمہارے اندر بے پناہ معجزانہ قوت (قوت فارقہ بین الحق والباطل) پیدا کرے گا۔ اور تمہاری لغزشوں کو معاف کر دیگا

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب
تنہا جہاں بگیرد بے منّتِ سپاہی

اسی سے سیرت و کردار میں پختگی اور اعمال میں نظم و انضباط پیدا ہوتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچی بات کہو۔ خدا تمہارے اعمال میں درستی پیدا کر دے گا

(سورۂ احزاب)

غرض تقویٰ اپنے مفہوم کے اعتبار سے تمام انسانی افکار و اعمال پر حاوی ہے۔ اور زندگی کا کوئی زاویہ اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہیں یہاں تک کہ اطاعت و ایثار جو حیاتِ اجتماعی کے لوازم ہیں اسی تقویٰ سے حاصل ہوتے ہیں۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ	اللہ سے ڈرو۔ اپنے معاملات کی اصلاح کرو۔ اور خدا اور رسول کی اطاعت کرو

(انفال)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب تک ظاہر و باطن کی اصلاح نہ ہو جائے جو تقویٰ کا منشاء ہے حقیقی اطاعت کا جذبہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آیت میں تقویٰ کے بعد اصلاح اور اصلاح کے بعد اطاعت کا ذکر ہوا ہے

فرد کی تکمیل ذات اور ارتقائی معاشرہ

کائنات کے نظام ارتقا کی مختلف کڑیوں میں عمیق نظر کرنے سے یہ بات خود ہی نمایاں ہو جاتی ہے کہ ہر چیز کا نشو و ارتقا محض بخت و اتفاق کا نتیجہ نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی تہ میں علل و اسباب اور قوانین فطرت کا ایک وسیع سلسلہ کارفرما ہوتا ہے۔ اور ہر شے کے وجود کو ابتدا سے انتہا تک بہت سے تدریجی مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں تا آنکہ وہ کمالِ وجود کی منزل تک رسائی حاصل کرتی ہے۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی چیز یکایک ہی اور تدریجی مراحل طے کئے بغیر ہی نشو و ارتقا کی آخری منزل تک پہنچ جائے کہ ایسا ہونا سنۃ اللہ کے خلاف ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلاً

مثلاً یوں سمجھئے کہ آپ زمین میں ایک ننھا سا پودا لگاتے ہیں۔ اور یہ بات کبھی آپ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتی کہ یہ پودا ایک دو دن ہی میں تناور درخت بن جائے گا بلکہ آپ پہلے دن ہی اس یقین کے ساتھ یہ پودا لگاتے ہیں کہ اگر اس کی مناسب اور طریق سے آبیاری اور نگہداشت کی گئی۔ تو یہ عام فطری اور طبعی دستور کے مطابق ایک عرصہ تک درخت بن جائے گا۔ اب اس پودے کو ننھے سے وجود سے لے کر کمالِ رشد بلوغ تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں اور اس کے اس تدریجی ارتقا میں ایک طرف آپ کے عمل و سعی کو دخل ہے اور دوسری طرف زمین کی صلاحیتوں اور فطرت کی کارفرمائیوں کو!

یہ تو عالم آفاق کی ایک مثال ہے۔ اب عالم انفس کی نسبت غور کیجئے۔ یہ سلسلۂ توالد و تناسل جو نوع انسانی کے بقاء و تسلسل کے لئے ناگزیر ہے ایک طبعی اور فطری دستور کے مطابق روزِ اوّل ہی سے جاری ہے۔ اور اس میں ان تمام اعمال و وظائف کی ضرورت پڑتی ہے۔ جن کو روزمرہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ یعنی سب سے پہلے جنسی تعلق یا رشتۂ ازدواج کی ضرورت ہے کہ عشق و محبت اور حسن و رعنائی کے لطیف جذبات کی اٹھان اور ان کے معتدل امتزاج کے بغیر سرے سے کوئی بات ہی نہیں بنتی۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اور اس کے بعد شوہر و زن کی صلب و ترائب سے نکلنے والا قطرۂ آب عورت کے رحم میں پہنچ کر کتنے تحولات و تغیرات اختیار کرتا ہوا مکمل جنین کی شکل اختیار کرتا ہے؟

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ط

بے شک ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصے سے پیدا کیا، اس کے بعد ہم نے اس کو استوار جگہ میں نطفہ کی شکل میں رکھا، پھر نطفہ کو خون کے لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو پارہ گوشت بنایا، پھر پارۂ گوشت کو ہڈیوں کی صورت عطا کی، پھر ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا، اور اس کے بعد

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ایک دوسری شکل میں اس کو پیدا کیا۔
(المؤمنون) پس بابرکت ہے اللہ تعالیٰ جو بہت ہی
اچھا پیدا کرنے والا ہے

اور پھر اس جنین کے باہر آنے کے بعد اس کی ابتدائی حالت کو دیکھئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک اور ننھا سا پھول ہے۔ لیکن ایک معین اسلوب کے ساتھ اس کی حالتیں بدلتی چلی جاتی ہیں، جب وہ بہت زیادہ نحیف ہوتا ہے تو ماں کی گود ہی اس کی قیام گاہ ہوتی ہے۔ اور جب اس کے جسم میں توانائی آتی ہے تو آہستہ آہستہ وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ بتدریج عالم شباب میں قدم رکھتا ہے۔ دیکھئے یہاں بھی ابتدائی حالت سے عہد کمال و شباب تک بچہ کے نشو و نما میں بہت سی قوتیں کارفرما رہی ہیں۔ ایک طرف ماں کی انتہا محبت ہے جو قدم قدم پر اس کی آسودگیوں کا لحاظ رکھتی ہے اس کی ہر ضرورت و خواہش کو پورا کرتی ہے۔ اور اس کی خاطر اپنی جان کو انتہائی محنت و مشقت میں ڈال دیتی ہے۔ سونے والے گہری نیند کا لطف اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ بچہ کے رونے کی آواز سنتی رہی رات کو اٹھ اٹھ کر بیٹھتی اور بچہ کو لوریاں دے دے کر سلاتی ہے۔ اگر بچہ کو کوئی معمولی تکلیف پہنچ جاتی ہے۔ تو اس کا سینہ چھلنی ہوا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف دیکھئے کہ بچہ کے طبعی تقاضوں کی تکمیل کس طرح ہو رہی ہوتی ہے۔ جب وہ ٹھوس غذا کھانے کے قابل نہ تھا تو شیر مادر سے غذائیت حاصل کرتا تھا۔ اور جب وہ اس قابل بنا کہ ٹھوس غذا ہضم کر سکے تو آہستہ

آہستہ اِسے ٹھوس غذا کا عادی بنایا گیا اور پھر ذہنی اور فکری طور پر اس کے تدریجی ارتقا کی حالت بھی ایسی ہی ہے۔ عقل و شعور سے پہلے فطرت و وجدان نے اس کی قدم قدم پر رہنمائی کی اور پھر جُوں جُوں بڑھتا گیا اس کی ذہنی قوتوں میں جِلا پیدا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ زمانہ شباب تک اس کا ذہنی شعور بھی تکمیلی مرحلے طے کرتا چلا گیا۔

حاصل یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اور خود انسانی شخصیت کا جب حال یہ ہے کہ وہ مقررہ اور معین دستورِ فطرت سے الگ رہ کر نہ صرف یہ کہ اپنی ارتقائی حرکت کو جاری نہیں رکھ سکتی بلکہ سرے سے اپنے وجود ہی کو فنا و عدم کی دستبرد سے نہیں بچا سکتی تو انسانی سوسائٹی اور اس کے نظامِ حیات کو ہم ان ہمہ گیر قوانینِ فطرت اور آفاق گیر اصولِ زندگی سے کیسے الگ کر سکتے ہیں؟ اور پھر یہ بات بھی مسلّمہ ہے کہ جماعت افراد و اشخاص سے باہر کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ ان کی ہیئت وحدانیہ کا نام ہی جماعت ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ افراد کا شعور ذات اور قوائے فکر و عمل تو ناقص اور غیر صالح ہوں اور ان کا مجموعہ (جماعت) نشو و ارتقا اور صلاح و تقوی کے درجۂ کمال کو پہنچ جائے؟ حق یہ ہے کہ ایک صالح اور ارتقائی معاشرہ کی تشکیل میں اس بات کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شخصی اور انفرادی سیرت کی تعمیر کے سوا اجتماعی سیرت کی تعمیر کسی صورت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ سوسائٹی کے مختلف اداروں کی خواہ کتنی ہی نگرانی کریں اور حکومتی شعبوں کے کارکنوں پر دن رات پہرے بٹھائے رکھیں۔ لیکن قلب و ذہن کی بنیادی اور حقیقی تبدیلی

کے سوا آپ ان میں دیانت و امانت اور راستبازی کی وہ جھلک ہرگز نہ دیکھ سکیں گے۔ جو ذہنی تبدیلی کے بعد بغیر کسی نگرانی کے آپ ان کے اندر دیکھ سکیں گے۔

قرآنِ حکیم اس باب میں ہماری صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس نے اس بات کا اظہار ایک ہی مرتبہ نہیں بلکہ سینکڑوں مرتبہ کیا ہے کہ حقیقی پُر امن زندگی جسے وہ کبھی "حیوٰۃً طیبۃً (پاکیزہ زندگی) کبھی" عیشۃً راضیۃً (خوشگوار زندگی) اور کبھی "الیُسریٰ" (خوشحال زندگی) کے معصوم الفاظ سے تعبیر کرتا ہے یقین و عمل اور ایمان و تقویٰ کے سوا کبھی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○
(النحل)

جو اچھے اور نیک کام کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن رہو۔ تو ہم اس کو پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔ اور ان کو ان کے اعمال کی نسبت بہتر اجر دیں گے

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ ○ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ
(القارعۃ)

پس میزانِ عدل میں جس کے اعمالِ نیک بھاری ہوں گے۔ وہ پسندیدہ اور خوشگوار زندگی بسر کرے گا۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۙ	پس جو شخص عطا و بخشش کرے گا
وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۙ	نیک عملی کی زندگی بسر کرے گا۔
فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی ؕ	اور اچھی بات کی تصدیق کرے گا
(اللیل)	تو ہم اس کو خوشحال زندگی کی جانب رہنمائی کریں گے

قرآن حکیم اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اصلاح ذہن اور تزکیۂ قلب کے ذریعہ ہی سے افراد و جماعات کو عیش جاوداں اور نشاطِ پیہم یا حقیقی امن و فلاح کی زندگی میسر آسکتی ہے اور یہ منزل طے کئے بغیر زندگی کو کامرانیوں اور بامرادیوں کی ہلکی سے ہلکی جھلک بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۙ	اس نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔ اور وہ خاسر و
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ؕ	بے مراد رہا۔ جس نے اپنے نفس
(الشمس)	کو آلودہ کیا

مدنیت صالحہ اور مدنیت فاسدہ

ان حقائق کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا۔ کہ انسانی تصورات قوم و ملت کے تعمیری ارکان میں "خشت اوّل" کی حیثیت رکھتے ہیں بالخصوص وہ اجتماعی نظریئے جو فرد کے دائرہ وجود سے آگے نکل کر جماعت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اپنی عمومی نوعیت کے اعتبار سے صرف جماعتی فکر اور جماعتی کردار میں تبدیلی پیدا کرتے ہیں اور تصور اجتماع بھی ان ہی عمومی تصورات سے ہے۔ جو جماعتی سیرت اور جماعتی نظم کی تخلیق میں سب سے زیادہ موثر ہیں یعنی قوم و ملت کے صلاح و فساد میں سب سے زیادہ اسی کو دخل ہے اور اسی سے مدنیت صالحہ یا مدنیت فاسدہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر داعیہ اجتماع کو داعیہ فطرت سے کامل مناسبت ہوگی تو اس سے ایک صالح مدنیت اور صالح طرزِ اجتماع عالم وجود میں آئے گا۔ اور پھر اس حضارت و مدنیت سے ایک صالح اور مہذب سوسائٹی کی تکوین ہوگی۔ جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مثالی (آئیڈیل) حیثیت کی مالک ہوگی۔ اور اس کا وجود ساری دنیا کے نظم پر اثرانداز ہوگا۔ بلکہ کائناتِ عالم کے حقیر سے حقیر ذرے بھی اس کی ضیا باریوں سے چمک اٹھیں گے

اور متضاد فطرت داعیہ اجتماع سے جس ہیئت اجتماعی کی تشکیل ہوگی وہ نوع انسانی کو تعرِ مذلت کی طرف لے جائے گی۔ یہاں تک کہ ساری دنیا اس کے ناپاک وجود سے ہلاکت و بربادی کے جہنم میں جا پڑے گی۔

کسی نظریۂ اجتماع کے صلاح و فساد کا یہی ایک معیار ہے۔ جس سے اس کے حسن و قبح کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مگر اقوامِ حاضرہ ان حقایق سے دانستہ یا نادانستہ بے اعتنائی کر رہی ہیں۔ جس کے تلخ نتائج سے آج ان کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔

انسان کو جس قدر اپنی عقل و دانش اور فہم و ادراک پر فخر ہے۔ اس کے بجائے اگر اس کی نظر اپنی کم مایگی اور عجز و بے بسی پر ہوتی۔ تو عالمِ انسانی اس عالمگیر اضطراب اور یاس و نومیدی کے ہجوم سے محفوظ ہوتا۔ عدل و انصاف اور امن و مساوات کی اس طرح ہرگز رسوائی نہ ہوتی جس طرح کہ آج ہو رہی ہے۔ مگر خود فریبی و خود بینی، نوامیسِ فطرت سے بے اعتنائی اور ظالمانہ طرزِ اجتماع نے آج اسے یاس و حرماں اور حسرت و ناکامی کے ایسے بحرِ ناپیدا کنار میں ڈھکیل دیا ہے۔ جہاں سے اس کی نجات امرِ موہوم ہو کے رہ گئی ہے۔

مگر تعجب ہے کہ حضرت انسان کچھ اس طرح زمان و مکان کے طلسم میں کھو گیا ہے۔ کہ ان دہشت ناک خونین مناظر کو دیکھتے ہوئے بھی اپنے طرزِ عمل پر غور نہیں کرتا۔ اور فضائے عالم میں پھیلی ہوئی تاریکیوں "ظلمت بعضہا فوق بعض" سے نکل کر حق و صداقت کی شعاعِ تاباں "نورِ مبین" کی طرف نہیں آنا چاہتا۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی انسان کی شومئ قسمت اور سیاہ بختی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ کہ ہلاکت و بربادی کے تیرہ و تار بادل سر پر منڈلا رہے ہیں۔ مگر اس کی غلط روی میں سرِ مو فرق نہ آئے

عذاب الٰہی کی بجلیاں لگاتار کوند رہی ہیں۔ مگر یہ خواب غفلت سے بیدار نہ ہو۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (سورۂ حم سجدہ)

آفاق عالم اور عالم انفس میں ہم ان منکرانِ حق کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان کو کتاب اللہ کی صداقت تسلیم کرنی پڑے گی

دوسری جنگِ عظیم کے نتائج نے آج کا بنات انسانی کو جن مصائب سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ کم ہونے کے بجائے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور ابھی ایک تیسری جنگ کے لئے مادہ پک رہا ہے۔ اور کچھ پتہ نہیں کہ آئندہ جنگ کے نتائج کیا ہوں گے۔ اور دنیا کی بڑی سلطنتوں دگریٹ امپائرز) کا آئندہ نقشہ کیا ہوگا؟

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم (اقبال)

کتاب و سنت کی روشنی میں صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ عالمگیر اضطراب و بے چینی، اسی تذبذبِ فاسدہ اور ظالمانہ طرز اجتماع کا قدرتی معاکسہ عمل (ری ایکشن) ہے

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ

بحر و بر کا یہ ہمہ گیر فساد انسانوں کی لگاتار بداعمالیوں اور بدعنوانیوں کا نتیجہ ہے۔ تاکہ اللہ تعالےٰ ان کو

الذی عَمِلُوْا لَعَلَّھُمْ یَرْجِعُوْنَ ۔ (روم)

ان کے اعمال کا مزہ چکھائے کہ شاید وہ حق کی طرف رجوع کریں

آج اس عذاب الٰہی کے مناظر ہمارے سامنے ہیں ۔ جس کے امثال و نظائر کتب سماویہ میں اقوام سابقہ کے تذکروں میں ملتے ہیں ۔ آپ کو دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ قرآن کریم کے ایک ایک لفظ سے آپ کو اس حقیقت باہرہ کا یقین ہو سکتا ہے ۔ کہ خدائے قدوس کی مخفی اور پر اسرار طاقتیں ہر وقت اپنے کام میں مصروف اور مناسب وقت کی منتظر رہتی ہیں ۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللہَ غَافِلًا عَمَّا یَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ

تم اللہ کو ان ظالموں کی بد اعمالیوں سے غافل تصور نہ کرو

قرآن کریم دنیا کے انسانوں کو متنبہ کر رہا ہے ۔ کہ سنن الٰہیہ اور مکافاتِ عمل کے قدرتی نتائج پر غور کرو اقوام سابقہ کی تاریخ (ہسٹری آف نیشنز) کو امعانِ نظر سے دیکھو اور سوچو کہ ہم نے ان ظالم اقوام سے کیا سلوک کیا ؟

وَسَکَنْتُمْ فِیْ مَسٰکِنِ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ وَتَبَیَّنَ لَکُمْ کَیْفَ فَعَلْنَا بِھِمْ وَضَرَبْنَا لَکُمُ الْاَمْثَالَ (ابراہیم پ ۱۳)

تم بھی ان ظالموں کی بستیوں میں رہ رہے ہو اور تمہیں معلوم ہو چکا کہ ان سے ہم نے کیا سلوک عبرت و موعظت کی مثالیں تمہارے لئے بیان کر دی ہیں

قدرت کا قانون کیا ہے؟ جب انسانی آبادی ظلم و عدوان، جبر و قہر زر پرستی، خود غرضی اور غصب حقوقِ انسانی سے مضطرب ہو جاتی ہے تو خدا کی انتقامی قوتیں حرکت میں آجاتی ہیں، پھر کیا ہوتا ہے؟ آبادیوں پر قہر الٰہی نازل ہوتا ہے اور تمام بستیاں ویرانوں اور کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہ عذاب الٰہی کبھی آسمان کی بلندی سے اترتا ہے کبھی زمین کے نیچے سے اُبل پڑتا ہے اور کبھی اقوام عالم میں حسد و رقابت کی چنگاریاں سلگنے لگتی ہیں۔ اور ان کو خطرناک طبقاتی جنگ (سیکشنل وار) میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جس کی شعلہ باریوں سے انسانوں کے ردّی اور فاسد عناصر کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور بقاء اصلح کے قدرتی تصور کے مطابق دنیا میں وہ صالح انسان باقی رہ جاتے ہیں۔ جو صحیح طور پر خدا کی زمین میں امن و مساوات اور عدل و انصاف کے علمبردار ہوتے ہیں اور انسانیت کو انسانی حاکمیت کے جبر و تشدد سے نکال کر "الارض للہ" کا اعلان کرتے ہیں۔

قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابًا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعًا و یذیق بعضکم بأس بعض	خدائے قدوس اس پر قادر ہے کہ بلندی سے عذاب اتارے یا زمین کے نیچے سے یا تم کو کئی طبقوں میں تقسیم کر کے ایک خطرناک طبقاتی جنگ میں ڈھکیل دے

(آیہ:

اقوامِ سابقہ کی بہت سی مثالیں قرآنِ حکیم نے وضاحت سے بیان کر دی ہیں۔ جو ارتکابِ منکرات و منہیات اور فساد و عصیان کی وجہ سے قدرت کے "بطش شدید" میں آئیں، اُن کے پُر رونق شہر، سربفلک عمارتیں اور اموال و املاک کو ایک ہی لمحہ میں پیوندِ خاک بنا دیا گیا۔ اور بستیاں اس طرح ویران ہوگئیں کہ اس کے بعد پھر کبھی آباد نہ ہو سکیں

ولم تسکن من بعدھم الّا قلیلاً (آیہ)

قرآن کریم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن قوموں کی تباہی کی وجہ نوامیسِ فطرت کی توہین اور ان کے طرزِ اجتماع کا فساد و اختلال تھا۔ ان کے فکر و عمل اور طریقِ تمدن و معشیت میں رخنہ پیدا ہو گیا تھا۔ اور ضابطۂ اخلاق کی کڑیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں

وَکَمْ اَھْلَکْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ بَطِرَتْ مَعِیْشَتَھَا فَتِلْکَ مَسٰکِنُھُمْ لَمْ تُسْکَنْ مِّنْ ۢ بَعْدِھِمْ اِلَّا قَلِیْلًا (قصص)

بہت سی بستیاں جنہوں نے نظری طرزِ معشیت کی حدوں کو توڑ دیا۔ ان کو ہم نے ہلاک کیا اب یہ ان کے مکانات ہیں۔ جو غیر آباد اور سنسان پڑے ہیں اور ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے۔

اذا اردنا ان نھلک قریۃً اَمَرْنَا مترفیھا ففسقوا فیھا (الآیہ)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو بہت سے امرا پیدا کر دیتے ہیں۔ یا اُن کی دولت بڑھا دیتے

ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ فسق و فجور میں مبتلا ہو جاتے ہیں

یہاں" اَمَرنا" کے معنے" اکثرنا" کے لئے گئے ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے اس آیت کی جو تفسیر نقل کی گئی ہے۔ اس میں انہوں نے امر کے معنے کثرت کے بیان فرماتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں :-

كُنَّا نَقُوْلُ لِلْحَيِّ اِذَا كَثُرُوا فِي الجَاهِلِيَّةِ اَمِرَ بَنُوْفُلَانٍ (بخاری کتاب التفسیر)	زمانہ جاہلیت میں جب کسی قبیلہ کی تعداد بڑھ جاتی تو ہم کہتے تھے کہ فلاں قبیلہ کے لوگ بڑھ گئے تھے۔

قرآنِ حکیم میں غور کرنے سے یہ حقیقت ابھری ہوئی نظر آتی ہے کہ اقوام عالم کے عروج و زوال کا پس منظر ان کے طرزِ اجتماع اور طریق تمدن کے طبعی یا غیر طبعی رحجانات ہیں۔ اس کتابِ ہدایت میں ہر قوم کی دو حالتیں دکھائی گئی ہیں۔ ایک حالت یہ ہے۔ کہ وہ قوانین طبعی (لاز آف نیچر) کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ اخلاق و سیرت حضارت و تمدن اور معاشی اعتبار سے بہت اونچی سطح پر کھڑی ہے۔ امن و خوش حالی اور لیسر و فراغ کے تمام وسایل اُسے میسر ہیں۔ اور آزادی و حریت کی نعمت سے مالا مال ہے

اور دوسری حالت یہ ہے۔ کہ دولت و ثروت کی فراوانی اور سامان معشیت کی کثرت نے اُسے اندھا کر دیا ہے۔ اور اب وہ نشۂ دولت

میں مخمور اور نوامیسِ فطرت سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اخلاقی قیود و اقدار اور طبعی قوانین سے آزاد اور خلاف فطرت خواہشات کی غلام بن چکی ہے۔ بس اجتماع و سوسائیٹی کی یہی وہ ناقابلِ اصلاح حالت ہے۔ جس سے قدرت کا ضابطۂ اِنتقام حرکت میں آ جاتا ہے۔

وکذٰلک اخذُ ربّک اذا	خدا تعالیٰ کی پکڑ ایسی ہی ہے۔
اَخذَ القریٰ وھی ظالمۃ	جب کہ وہ ظالم اقوام کو پکڑتا ہے
ان اخذہٗ الیم شدید	بے شک اس کی پکڑ بہت سخت اور دردناک ہے۔

مثال کے طور پر قوم "سباءؑ" کا جہاں ذکر آتا ہے۔ تو پہلے اس کی حالتِ فراغ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔

لقد کان لسبأ فی مسکنہم	قوم سباء کے لئے ان کے اپنے وطن
آیۃ جنتان عن یمینٍ و	میں قدرت کی نشانی موجود تھی۔
شمالٍ و کلوا من رزقِ	یعنی زمین سو مربع میل تک باغ ہی
ربّکم واشکروا لہ	باغ تھے۔ اور ان سے کہدیا گیا
بلدۃ طیّبۃ و ربّ غفورٌ	تھا۔ کہ خوب کھاؤ اور خدا کا شکر
	کرو۔ رہنے کو پاکیزہ شہر ہے۔ اور
(سبأ)	رب معاف کرنے والا ہے۔

مگر اس کے بعد ان کی دوسری حالت کا جس رنگ میں تذکرہ کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ کریں

وَظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ فَجَعَلْنَاهُمْ اَحَادِیْثَ وَمَزَّقْنَاهُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ (سبا)	انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اور ہم نے ان کو حقیقت سے افسانہ بنا کر رکھ دیا۔ اور ان کے ٹکڑے اڑا دیئے۔

ے ومُزِّقَتْ سَبَأٌ فِی کُلِّ نَاحِیَةٍ
فَمَا الْتَقٰی وَائِحٌ مِنْهُمْ بِمُبْتَکِرٍ ابن عبدون

مُلک کے ہر حصّے میں سبا کے پُرزے اڑا دیئے گئے۔ اور کسی صبح کرنے والے کو اُن کی ہوا بھی نہ پہنچ سکی۔

انسانی اعمال کے طبعی اثرات ونتائج

متذکرہ بالا آیاتِ قرآنی نے عالم طبعی کی ایک مہتم بالشان حقیقت کو وا انکشاف کر دیا ہے۔ کہ اس کائنات میں ہر چیز کا ایک طبعی خاصہ ہوتا ہے۔ اور اس کے جُداگانہ اثرات و نتائج ہوتے ہیں۔ مثلاً بارش ہی کو لیجئے اس کا طبعی اور قدرتی نتیجہ یہ ہے۔ کہ اس سے مُردہ زمین کو ازسرِ نو زندگی ملتی ہے گلشن خزاں رسیدہ میں بہار آتی ہے، مادرِ فطرت عروسانِ چمن کو خوش وضع اور حسین لباس پہناتی ہے، زمین اپنے پیٹ کی پہنائیوں سے سبزہ و نباتات کو باہر آنے کا موقع دیتی ہے۔ اور گل و لالہ اپنی تمام رعنائیوں اور عطر بیزیوں کے ساتھ صحنِ گلشن میں مہکنے لگتا ہے۔

وَتَرَی الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَا تم زمین کو پژمردہ دیکھتے ہو

انزلنا علیہا الماء اھتزت و ربت و انبتت من کل زوج بھیج۔ | پس جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں۔ تو حرکت کرتی اور اُبھر آتی ہے۔ اور ہر قسم کے بارونق جوڑے اُگاتی ہیں (حج)

آپ غور کریں کہ جب کچھ عرصہ بارش رک جاتی ہے تو نظام کائنات میں اختلال رونما ہونے لگتا ہے، زندگی کی تمام مسرتیں رنج و مصیبت میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور آپ کی چشم انتظار بار بار آسمان کی طرف اٹھتی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ آپ جانتے ہیں کہ بارش کے نزول کے بغیر زندگی کا قیام و بقا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

اسی طرح سورج کو دیکھئے، اس کے کچھ طبعی خواص ہیں یعنی حرارت اور نور و ضیا۔ جب آپ سورج کا تصوّر کرتے ہیں۔ تو یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کے ان خواص کا تصوّر خود بخود ہی آپ کے ذہن میں نہ آئے۔ کیونکہ یہ اس کے وجود کے ساتھ لازم ہیں اور ان کے اثرات و نتائج کو روزمرہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں، مثلاً روز و شب، حرارت و برودت اور نور و ظلمت سورج ہی کے مثبت اور منفی نتائج ہیں اور جب سے یہ کائنات بنی ہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ سورج نے طلوع کیا ہو اور دن، حرارت اور نور و ضیا اس کے ساتھ ساتھ نہ آئے ہوں

بالکل یہی حال انسانوں کے انفرادی اور اجتماعی اعمال کا ہے۔ یعنی اعمالِ انسانی بھی جدا جدا خواص رکھتے ہیں اور ان خواص کے اعتبار سے ان کے طبعی نتائج کا ظہور ہوتا ہے، جس طرح کے اعمال ہوں گے، ایسے ہی ان کے نتائج برآمد ہونگے

پاکیزہ سیرت، نیک عملی، حسنِ کردار اور عمل صالح کا طبعی اور قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ربط و نظم، حسن و موزونیت، یُسر و فراغ، امن و خوش حالی، سکون و اطمینان اور راحت و طمانیت پیدا ہوگی اور صالح و پاکباز افراد کی ترکیب سے ایک بے ضرر، پرامن اور خوشحال معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا۔ اس کے برعکس بدعملی، فحش کاری اور عملِ سیئ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے حیات انسانی میں انتشار و بدنظمی اور بدامنی و اضطراب پیدا ہوتا ہے، افراد انسانی میں باہم بغض و عناد، خود غرضی اور انسانیت کشی کی بیماریاں بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہیں اور ایسے افراد سے ایک بیمار اور جاں بلب معاشرۂ انسانی کی تشکیل ہوتی ہے۔ جو اپنی ذات میں ہلاکت و بربادی کے جراثیم لئے ہوئے ہوتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس حقیقت کو ایک دلچسپ مثال کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔

البلد الطیب یخرج نباتہ باذن ربہ والذی خبث لا یخرج الا نکدا کذلک نصرف الآیات لقوم یشکرون	پاکیزہ زمین سے سبزہ پیدا ہوتا ہے۔ اپنے رب کے حکم سے اور جو گھٹیا زمین ہے اس سے ناقص چیزیں ہی اُگتی ہیں ہم اسی طرح بار بار آیات بیان کرتے ہیں شکر کرنے والی قوم کے لئے
(الاعراف)	

نیز قرآن کریم صالحیت اور فسق و معصیت کے اس طبعی تضاد اور ان کے الگ الگ نتائج کو متعدد اسالیبِ بیان سے ذکر کرتا ہے۔

افمن کان مومنا کمن کان فاسقا	کیا جو ایمان دار ہے (اس کا انجام)

لَا يَسْتَوُنَ ٥	فاسق کی طرح ہوگا، یہ دونوں ہرگز برابر
(السجدہ)	نہیں ہوں گے
اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ٥	کیا وہ لوگ جو برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان سے ایمان والوں اور اچھے کام کرنے والوں کی طرح سلوک کریں گے۔ کہ ان دونوں گروہوں کی زندگی اور موت یکساں ہو گی
(الجاثیہ)	یہ لوگ بہت برا فیصلہ کرتے ہیں
او من كان ميتا فاحييناه وجعلنا له نوراً يمشي به في الناس كمن مثله في الظلمت ليس بخارج منها ٥	کیا وہ جو بے جان تھا اور ہم نے اس کو زندگی عطا کی اور اس کے لئے ایک روشنی پیدا کی جس سے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے، اس شخص کی طرح ہے جس کی مثال یہ ہے کہ وہ اندھیروں میں گم ہے۔ اور ان سے باہر نہیں نکل سکتا؟
(الانعام)	
افمن اتبع رضوان الله كمن باء بسخط من الله وماوٰه جهنم وبئس المصير	کیا وہ جو اللہ کی رضا مندی کے پیچھے چلتا ہے۔ اس شخص کی طرح جو اللہ کے غیظ و غضب کے ساتھ لوٹتا ہے؟ اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور یہ برا ٹھکانا ہے۔
(آل عمران)	

اَفَمَنْ کَانَ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّہٖ کَمَنْ زُیِّنَ لَہٗ سُوْٓءُ عَمَلِہٖ وَ اتَّبَعُوْٓا اَھْوَآءَھُم (محمد)

کیا وہ جو اپنے رب کی طرف سے کھلی ہوئی ہدایت پر قائم ہے۔ اُس کی طرح ہے جس کے لیے اُس کے اعمالِ بد خوبصورت بنا دیئے گئے ہیں۔ اور وہ اپنی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں؟

ان آیات سے ظاہر ہے کہ اعمالِ حسنہ اور اعمالِ سیئہ اپنی طبیعت سے انسانی تمدن و معاشرت میں جُدا جُدا اثر و تغیر پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ عمل صالح سے وہ نتائج برآمد ہوں جو عمل سئی سے برآمد ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عمل سئی پر وہ اثرات مرتب ہوں جو عمل صالح پر مرتب ہوتے ہیں۔ بلکہ آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی انسانی عمل ہے اور وہ معنوی اور مقصدی اختلاف کی وجہ سے بالکل الگ الگ اثرات پیدا کرتا ہے۔ مثلاً انفاق ہی کو دیکھیے ایک جگہ اس کا مقصد نیک ہے اور وہ اچھے نتائج پیدا کرتا ہے

ومثل الذین ینفقون اموالھم ابتغآء مرضات اللہ وتثبیتا من انفسھم کمثل جنۃ بربوۃ اصابھا وابل فاتت اکلھا ضعفین فان لم یصبھا وابل فطل واللہ بما تعملون بصیر ۝ (البقرہ)

ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا مندی کی طالب اور اپنے دلوں کی پختگی کے لئے اپنے مال خرچ کرتے ہیں اُس باغ کی سی ہے۔ جو بلند جگہ پر واقع ہو کہ اگر اس پر بارش برسے تو دگنا پھل لائے اور اگر بارش نہ برسے تو شبنم ہی اس کے لیے کافی ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھنے والا ہے۔

اور دوسری جگہ اس کا مقصد برا ہے۔ اور اس سے برے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

مثل ما ینفقون فی ھذہ الحیوۃ الدنیا کمثل ریح فیھا صر اصابت حرث قوم ظلموا انفسھم فاھلکتہ وما ظلمھم اللہ ولکن انفسھم یظلمون ۔

جو لوگ اپنا مال اس دنیا کے مفاد کے لئے خرچ کرتے ہیں ان کی مثال یہ ہے کہ ہوا جس میں شدید سردی ہو ایسی قوم کی کھیتی پر آ پہنچے جس نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہو (اور اس کو بالکل پامال کر دے)

(آل عمران)

قرآن حکیم متعدد اقوام کا ذکر کرتا ہے۔ جو اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے عذاب الہٰی کا شکار ہوئیں لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ عذاب ان قوموں کی زندگی کا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ یہ نتیجہ تھا۔ خود اُن کے رجحانِ فکر و عمل کا یعنی ان قوموں کے اعمال کا طبعی اور ذاتی اقتضاء ہی تھا جو خارج میں عبرتناک تباہی کی شکل میں متشکل ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جب ان کی تباہی و بربادی کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کا سبب ان کے اعمالِ سیئہ ہی کو قرار دیتا ہے۔

وکذلک اخذ ربک اذا اخذ القریٰ وھی ظالمۃ ان اخذہ الیم شدید

آپکے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے جبکہ وہ ظالم قوموں کو پکڑتا ہے بے شک اس کی پکڑ سخت دردناک ہے۔

(ہود)

قد مکرالذین من قبلهم فاتی الله بنیانهم من القواعد فخر علیهم السقف من فوقهم	ان لوگوں نے بھی ہماری تدبیر کی جو ان سے پہلے ہو گذرے ہیں پس آیا اللہ کا عذاب ان کی عمارتوں کی بنیادوں کی طرف سے، پس ان کے اوپر سے
(النحل)	ان پر چھت گر پڑی ۔

اور پھر قرآنِ حکیم نے اقوامِ ماضیہ کی تاریخ و تذکرہ پر ہی اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ایک عام کلیہ کی شکل میں بیان کر دیا ہے کہ جہاں اور جب بھی اس قسم کے اعمال کا ارتکاب ہوگا۔ ان کے اثرات و نتائج ایسے ہی برآمد ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان اعمال کا طبعی اور ذاتی اقتضا ہے ۔

وکذلك نفصل الایت ولتستبین سبیل المجرمین	اور اسی طرح ہم آیتیں بیان کرتے ہیں تاکہ مجرمین کی راہ رنتم پر واضح ہو
(الانعام)	جائے ۔
افامن الذین مکروا السیاٰت ان یخسف الله بهم الارض او یاتیهم العذاب من حیث لا یشعرون ○ اویاخذهم فی تقلبهم فما هم بمعجزین	کیا وہ لوگ جو بری تدبیریں کرتے ہیں۔ اس بات سے بے خطر ہیں کہ خدا ان کو زمین میں دھسا دے یا آئے ان پر عذاب اس جگہ سے کہ اس کو وہ نہیں جانتے یا پکڑے ان کو چلنے پھرنے
(النحل)	کی حالت میں۔ پس وہ عاجز کرنے والے نہیں ہیں ۔

اقوام حاضرہ کا طریقِ سیاست اور طرزِ اجتماع بھی اسی مرحلہ پر پہنچ چکا ہے - اور یہ صرف میں ہی نہیں کہتا - بلکہ خود اہلِ مغرب کے اہلِ دماغ اور سنجیدہ طبقے اس امر کا اعتراف کرتے ہیں - کہ آج یورپ کی سیاست و مدنیت ایک خطرناک حالت کو پہنچ چکی ہے - اور اس کی سب سے بڑی وجہ اقوام مغرب کی مادہ پرستی جذبۂ سرپرستی اور مذہب و روحانیت سے قطع تعلق ہے - جس نے ان اقوام کو اخلاقی قیود و اقدار اور نوامیسِ فطرت کی پابندی سے بے نیاز کر دیا ہے - اور عالمگیر اخوتِ انسانی کئی متخالف گروہوں میں تقسیم ہو کر رہ گئی ہے - چنانچہ اسی چیز نے ان کو دائمی اضطراب و بے چینی اور شورش و بدامنی کے بے کنار سمندر میں ڈھکیل دیا ہے - یہاں تک کہ آج وہ خود بھی اس جدید مہلک تمدن کے ہاتھوں سخت مصائب کا شکار بن چکے ہیں - اور آنے والے خطرات ان کی آنکھوں کے سامنے منڈلا رہے ہیں - اس ہلاکت خیز تمدن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے ہرچند ان کے اہلِ فکر حضرات کوشش کر رہے ہیں - مگر اب جب کہ اس مدنیت فاسدہ کی لہروں نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی - چنانچہ مشہور فرانسیسی مصنف فیرنس جیافرت اپنی کتاب "التمدن الحاضرہ" میں رقمطراز ہے:

" جو لوگ تفرد ناقہ اور رنج و مصیبت میں مبتلا ہیں ان کے

دلوں میں بغض وعناد اور عداوت و دشمنی کی چنگاریاں پہلے سے
زیادہ مشتعل ہو رہی ہیں اور اسی انداز کے ساتھ سرمایہ پرست
طبقوں میں کبر و نخوت کا جنون بھی بڑھتا جا رہا ہے۔ اور یہ
ترقی پذیر الحاد ہماری جماعات کے جذباتِ حریت و مساوات
کو ایک دائمی اور شدید انتقامی جذبہ میں تبدیل کر دے گا
ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ نوعِ انسانی کے مصائب کا ان مادی خزائن
سے مداوا کر سکیں گے۔ جو ایک زمانہ سے ہمارے آگے پڑے
ہیں۔ جیسے علماء ہندسین صناع، میکانکیسین (میکنکس) حیات
دنیوی کے عروج و ترقی کے لئے جان توڑ کوشش میں مصروف
ہیں۔ مگر ان اکتشافات سے صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا ہے
کہ عوامی طبقوں میں بھی سرمایہ پرستی کا مرض پہلے سے زیادہ
پھیلتا جا رہا ہے۔"

مجلۃ الازہر ربیع الاول ۱۳۵۵ھ

غرض اس طرح کے سینکڑوں فضلاء مغرب کے اقوال پیش
کئے جا سکتے ہیں۔ مگر ہم نہیں چاہتے کہ اصل مقصد سے ہٹ
کر دور از کار باتوں میں الجھ جائیں۔
یہاں تک تو صرف کتاب اللہ سے استشہاد کیا گیا ہے کہ مضادِ
فطرت تصورِ اجتماع سے جو مدنیت فاسدہ اور ظالمانہ طرزِ اجتماع
عالم وجود میں آتا ہے۔ وہ کائنات انسانی کو سخت خطرات و مہالک

میں مبتلا کر دیتا ہے ۔اب ذیل میں ہم احادیث و آثار سے بھی اس سلسلہ میں شہادتیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

عن عبادۃ ابن الصامت قال کان رسول اللہ یقول ان اللہ اذا اراد بقوم بقاءً او نماءً رزقھم السماحۃ والعفاف واذا اراد بقوم اقتطاعًا فتح علیھم باب خیانۃ ثم قرء حتی اذا فرحوا بما اوتوا اخذ ناھم بغتۃً فاذا ھم مبلسون

آنحضرت صلعم فرماتے تھے ۔ کہ اللہ تعالیٰ کو جب کسی قوم کا بقاٗ یا اس کی نشو ونما مطلوب ہوتی ہے تو اس میں فیاضی اور عفت و پاک دامنی کی طرح کی پاکیزہ صفات پیدا کر دیتا ہے اور جب کسی قوم کو ختم کرنا چاہتا ہے ۔تو اس پر خیانت بددیانتی اور اس قسم کی صفات ذمیمہ کے دروازے کھول دیتا ہے۔

(اخرجہ ابن عساکر) اس کے بعد آپ نے یہ آیت پڑھی:۔

یہاں تک کہ وہ ہماری دی ہوئی دولت پر مغرور ہو گئے ۔ تو ہم نے ان کو ناگہانی طور پر پکڑ لیا ۔ پس وہ یاس و ناامیدی کی حالت میں پڑے رہ گئے ۔

عن علیؓ قال ان اللہ فرض علی الأغنیاء فی اموالھم ما یکفی فقراء ھم وان

اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار فرض کی ہے جو غربا کے لئے کافی

جاعوا وعروا وجهدوا فيمنع الأغنياء وحق على الله ان يحاسبهم يوم القيامة و يعذبهم	ہو سکے اس کے باوجود اگر وہ بھوکے ننگے اور تنگدست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کے عدم توجہ اور بخل کی وجہ سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور اللہ نے اپنے لئے یہ ضروری قرار دیا ہے۔ کہ ان امراء سے قیامت کو محاسبہ لے اور ان کو عذاب دے
(اخرجہ البیہقی وسعید ابن منصور فی سننہ)	

جس طرح قوموں کے طرزِ اجتماع کا فساد و اختلال ان کی تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ اسی طرح صالح طرزِ اجتماع نظامِ عالم کے بقاء اور قوم وملت کی فلاح ونجات کو مستلزم ہے حضرت عبداللہ ابن رواحہ کے اس مشہور واقعہ سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا ہے۔

یہود خیبر نے حضرت عبداللہ ابن رواحہؓ کو بیش بہا زیورات کافی مال رشوت کے طور پر دینا چاہا۔ اور آپ سے درخواست کی کہ مالیہ کی رقم میں کچھ تخفیف کر دی جائے۔ اس موقعہ پر عبداللہ ابن رواحہ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا۔ اور پھر یہود کی زبان سے بے ساختہ جو الفاظ نکلے وہ بعینہٖ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں

قال عبد الله ابن رواحه	اے یہود کے گروہ تم خدا کی مخلوق
يا معشر اليهود انكم لمن	میں میرے نزدیک سب سے زیادہ
ابغض خلق الله الیّ و	قابل نفرت ہو۔ مگر اس کے باوجو

ما ذالك بحاملي على ان احيف عليكم فاما ما عرضتم من الرشوة فانما هي سحت وانا لا اكلها فقالوا بهذا قامت السموات والارض	میں تم پر ظلم کرنا روا نہیں سمجھتا - اور تم نے میرے آگے جو رشوت پیش کی ہے وہ حرام قطعی ہے اور میں اس کو ہرگز نہیں کھاؤں گا - یہ سن کر یہود پکار اٹھے کہ ایسی عدل و انصاف اور دیانت سے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے -

(موطا امام مالک)

آنحضرت صلعم کا ظہور اس وقت ہوا جبکہ اقوام عالم میں حسد و زنا کی چنگاریاں پوری قوت سے مشتعل ہو رہی تھیں - اور وہ ایک خطرناک طبقاتی جنگ کے کنارے پر کھڑی تھیں - طبقۂ امراء کا جذبۂ زرپرستی حد انتہا تک پہنچا ہوا تھا اور پس ماندہ طبقے ان ظالم اور سفاک انسانوں کے پنجۂ ہائے استبداد میں جکڑے ہوئے تھے - مگر سردار دو جہاں صلعم اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مقدس کوششوں نے اس جاہلی نظام اجتماع کے پرزے اڑا دیئے -

آنحضرت صلعم نے امراء کے پندار و غرور کو مٹانے اور غریب طبقوں کو ابھارنے کے لئے جو کامیاب جدوجہد فرمائی اس کے نتائج روز روشن کی طرح واضح ہیں ایک موقعہ پر آپ نے غرباء کی عظمت شان کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا -

هل تنصرون و ترزقون	اے طبقۂ امراء! غریبوں کی بدولت

الا بضعفاء کم (بخاری) ہی ہتیں ہر قسم کی مدد اور روزی ملتی ہے۔

مجھے آیندہ مباحث میں کتاب و سنت کی روشنی میں یہ بتانا ہے۔ کہ یہ تمام مفاسد و معائب جو موجودہ اجتماع انسانی میں پائے جاتے ہیں ان کا اصل سرچشمہ کیا ہے ؟ مگر اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ مسلمانوں کی روش فکر و عمل اور ان کے طرز اجتماع میں تبدیلی پیدا کرنے والے کون سے اسباب ہیں اور کس طرح مسلمانان عالم بالعموم اور مسلمانان ہند بالخصوص اسلامی طریق فکر و عمل کو ترک کر کے غیر اسلامی سیاست و اجتماع کے دام ہمرنگ زمین میں پھنس گئے ہیں ؟ یا یہ کہ جاہلی افکار و نظریات کس کس راستہ سے اسلامی نظریہ اجتماع میں نفوذ کر کے اس کے فساد و اختلال کا موجب بنے ہیں ؟

اسلامی نظامِ اجتماع

کے

اختلال کا تاریخی پس منظر

زمانۂ رسالت سے لے کر خلافت راشدہ کے آخری دور تک اسلام کا مقابلہ جاہلیتِ محضہ کے ساتھ تھا۔ یہ جاہلیت اگرچہ بڑی سخت جان تھی مگر اسلام کی نظریاتی اور عملی قوت کے مقابلہ میں اِسے ہر قدم پہ شکست کھانی پڑی۔ دنیا کے جس حصّہ میں بھی یہ اسلام سے متصادم ہوئی۔ اس کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور بالآخر مقہور و مجبور ہو کر رہ گئی۔
مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جو چیز ایک دفعہ کتم عدم سے منظرِ وجود پر آ گئی۔ وہ دنیائے ہستی سے کبھی بالکلیہ فنا نہیں ہو سکتی کیونکہ اس عالمِ رنگ و بُو میں ہر طرح کی چیز سما سکتی ہے۔ اور متضاد و متخالف امور و حقائق کے لئے اس نے کبھی تنگیٔ داماں کا عذر پیش نہیں کیا۔ بالخصوص ہر ایسی چیز جو انسانی طبائع کی مرغوب اور اہوائے نفس سے کچھ مناسبت رکھتی ہو۔ اُسے تو حضرت انسان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ کسی وقت اپنی ظاہری ہیئت و لباس کو بدل دے اور کسی دوسرے لباس میں دنیا کے سامنے آ جائے مگر لباس کی تبدیلی سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ چنانچہ جاہلیت خالصہ جب ہر معرکۂ جنگ میں شکست کھا چکی اور ہر میدانِ کارزار میں

بُری طرح پٹ چکی یہاں تک کہ اس کا سیاسی اور اجتماعی وجود ختم ہو کر رہ گیا تو اس نے اپنے بقاء کے لئے اسلام کے دامن میں ہی پناہ لینی چاہی۔

اب وہ شخصیتیں اٹھ چکی تھیں جو اسلام کے حصن حصین کے لئے "باب مغلق" کا کام دے رہی تھیں اور اُن کی موجودگی میں باہر کی کوئی چیز اس قلعہ کے اندر گھسنے کی جرأت نہیں کر سکتی تھی۔

(ان بینك و بینها بابا مغلقا) مگر جوں ہی یہ باب مغلق سامنے سے ہٹا تو جاہلیت نے اندر گھسنے کے کئی راستے بنا لئے۔ اب کیا تھا رسالت مآب صلعم کے ارشاد کے مطابق فتنوں کی موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔

انی لاری الفتن تقع فی بیوتکم کوقع المطر (بخاری) میں تمہارے گھروں میں فتنوں کی بارش دیکھ رہا ہوں۔

مگر پھر بھی جاہلیت کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے پہلے لباس میں اسلام کے سامنے آتی چنانچہ اب اس نے نیا چولا بدلا اور اسلام سے ساز و باز کرنی شروع کر دی کچھ دیا اور کچھ لیا اور بالآخر وہ اسلام سے جوڑ توڑ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ اب وہ بظاہر دیکھنے والوں کو مسلمان نظر آتی تھی۔ مگر باطن میں اسی طرح لات و منات کی چہیتی تھی!

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں
اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ دولت بنی

اُمیہ کے آغاز سے آج تک برابر جاری رہا۔ مگر یہ جاہلیت کم بخت اتنی زمانہ شناس واقع ہوئی ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں "احوال و ظروف" کے قالب میں ڈھلنے کی اسے پوری مہارت حاصل ہے۔ اس کے سامنے تو صرف ایک ہی مقصد رہا ہے۔ کہ اسلام کے نظامِ اجتماع میں کس طرح اختلال پیدا کیا جا سکتا ہے؟ کس راستہ سے اس پر حملہ و ہجوم ہو سکتا ہے اور کس لباس سے اُسے اپنی جانب مائل کیا جا سکتا ہے؟ زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کے طرز و طریق بھی بدلتے رہے۔ خلافتِ راشدہ کے انقطاع کے بعد سب سے پہلے اس نے ملوکیت و استبداد کا جامہ زیب تن کیا۔ کیونکہ اس کے بغیر اس کا اثر و نفوذ کسی شکل میں بڑھ نہیں سکتا تھا۔ اور یہی ایک چیز ہے۔ جو ہر زمانہ میں جاہلیت کی پشت پناہی کرتی رہی ہے۔ پس ملوکیت کے قیام کے ساتھ اس نے نقشہ زندگی کے ایک ایک خانہ پر اپنا رنگ جمانا شروع کیا۔ اور نظریۂ حکومت میں تبدیلی رونما ہونے کے ساتھ ہی اجتماع و تمدن کے تمام شعبوں میں انقلاب معکوس شروع ہو گیا۔

خلافتِ راشدہ کا عہدِ مقدس عہدِ رسالت سے مناسبتِ تامہ رکھتا تھا۔ اور اس کا نظامِ فکر و عمل بالکل طریقِ سنت اور منہاجِ نبوت پر قائم تھا۔ یہی وجہ ہے سردارِ دوجہاں صلعم نے خلفاء راشدین کے عمل و کردار کو لفظ سنت سے تعبیر فرمایا۔

عن العرباض ابن ساریہؓ میری سنت اور ہدایت یافتہ خلفا

قال رسول اللہ فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها و عضوا علیها بالنواجذ	راشدین کی سنّت کو لازم پکڑو اس کے ساتھ تمسک کرو اور نہایت مضبوطی سے اُسے پکڑ لو۔
(اخرجہ ابو داؤد و ترمذی)	
عن زید بن ارقمؓ قال قال رسول اللہ انی تارك فیکم ما ان تمسکتم به لن تضلوا بعدی احدهما اعظم من الآخر وهو کتاب اللہ حبل ممدود من السماء الی الارض وعترتی اهل بیتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض فانظروا کیف تخلفونی فیها	میں وہ چیز تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم اس سے تمسک کرو گے تو میرے بعد گمراہ نہ ہو سکو گے (اس چیز کے دو حصے ہیں) ایک ان میں سے دوسرے سے بڑا ہے۔ وہ اللہ کی کتاب ہے۔ جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی رسی ہے اور دوسرا میری عترت یعنی اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جُدا نہ ہوں گے۔ یہاں تک کہ قیامت کو میرے پاس حوض کوثر کے مقام پر وارد ہوں گے۔ دیکھو تم لوگ ان دونوں سے میرے بعد کیا سلوک کرتے ہو۔
(اخرجہ الترمذی)	

یہ دونوں روایتیں بظاہر الگ الگ مفہوم رکھتی ہیں۔ مگر درحقیقت ان کا مفہوم ایک ہی ہے۔ احادیث نبوی میں جہاں خلفاء راشدین کا ذکر آیا ہے۔ ان میں اہلِ بیت بھی شامل ہیں۔ اور جہاں عترت یا اہلِ بیت کا ذکر ہوا ہے۔ اس میں خلفاء راشدین بھی داخل ہیں چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اس کی تصریح کی ہے۔

گویا عترت اور اہل بیت سے مُراد رسول خدا صلعم کی روحانی اولاد ہے۔ جو صحیح طور پر اپنے روحانی باپ کے نقش قدم پر چلنے والی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ دونوں حدیثیں اپنے منشاء کے اعتبار سے بعد کے مجددین ملت اور مصلحینِ امت پر بھی حاوی ہیں۔ کیونکہ ان کا مسلک و طریق بھی خلفائے و اہل بیت کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ اور یہ مقدس ہستیاں گویا خلفاً الخلفاً ہیں لہذا اولاً و بالذات نہ سہی مگر بالتبع یہ بھی ان احادیث میں شامل ہیں۔

غرض خلفاء راشدین کا مقدس دور دینی، اخلاقی، سیاسی اور اجتماعی نقطۂ نظر سے بالکل عہد نبوت سے مشابہ تھا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین، صورت و سیرت، اخلاق و معاشرت اور عمل و کردار میں رسالت مآب صلعم کے زندہ نمونے تھے۔ اور وہ جہاں گئے وہاں کے لوگوں کو اپنے ہی رنگ میں رنگ دیا۔ ان کا کردار اور کیرکٹر دوسروں پر اثر انداز ہوتا

تھا۔ مگر وہ خود کسی سے متاثر نہ ہوتے تھے۔ اور انہوں نے ہی دنیا کے انسانوں کو صحیح اسلامی فکر و عمل اور سیاست و اجتماع سے روشناس کیا۔ مگر خلافت راشدہ کے انقطاع کے بعد زمام سیادت بنی اُمیہ کے ہاتھ آگئی اور اس وقت سے اسلامی طرزِ سیاست اور حریتِ اجتماع میں ایک ناخوشگوار انقلاب رونما ہوا۔ اب خالص اسلامی جمہوریت کے بعد ملوکیت و استبداد کا دور شروع ہوا اور اس ظالمانہ طرزِ سیاست نے اجتماع اسلامی کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ اگرچہ اس عہد میں صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی مگر بقول سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ الملک والدین توامان یعنی دین کا قیام حکومت کے بغیر ممکن نہیں۔ چونکہ قوت مقتدرہ جن جن اشخاص کے ہاتھوں میں منتقل ہوگئی تھی وہ انتہائی درجہ کے عیاش، بدکردار اور ظالم تھے۔ اور ظاہر ہے کہ انسانوں کے اخلاق و معاشرت اور اجتماع و تمدن پر سب سے زیادہ ملکی سیاست ہی اثر انداز ہوتی ہے اس لئے صحابہ کرام کی مجاہدانہ جدوجہد بھی اس سیلاب بلا کو نہ روک سکی

دورِ خلافت راشدہ میں آزادی فکر و رائے حریتِ اجتماع اور مساوات عامہ کو جس قدر اہمیت حاصل تھی اس سے اسلام کا کوئی بڑے سے بڑا مخالف بھی جرأتِ انکار نہیں کر سکتا جس کی تفصیل" اسلامی نظریۂ سیاست میں آ چکی ہے۔ اور آئندہ ابواب میں بھی انشاءاللہ اس پر بحث کی جائیگی مگر دورِ بنی اُمیہ کے آغاز میں ہی طبقاتی نظام اجتماع اور ظالمانہ تمدن کی بنیاد پڑ گئی۔ وہی جاگیردارانہ سسٹم، شریف و وضیع کے امتیازات

اور امیر و غریب کی تفریق جو اسلام کے دورِ اوّل میں ختم کر دی گئی تھی دوبارہ مسلمانوں کے طرزِ اجتماع میں داخل ہو گئی۔ افکار و عقائد میں فساد رونما ہونے لگا۔ اسلامی دستورِ اخلاق کو بدل دیا گیا۔ تعلیم و تربیت کے طرز و طریق میں تجدد کا سلسلہ جاری ہوا۔ شراب نوشی، بدمستی، عیش کوشی، جبر و تشدد اور تمام ملوکانہ صفات بروئے کار آنے لگیں۔

مگر تاریخ اسلامی کی یہ ایک درخشندہ حقیقت ہے کہ وہ پرستارانِ ملوکیت اور داعیانِ تجدد و تلبیس کے ساتھ ساتھ مردانِ راہ حق، داعیانِ حریت و آزادی، مجددینِ ملت اور مصلحینِ اُمت کی شاندار روایات پیش کر رہی ہے۔ اگر ایک طرف خود مسلمانوں سے ہی کوئی جابر و قاہر اور مختارِ مطلق حکمران پیدا ہوتا ہے۔ جو اپنے ظالمانہ کردار اور تجدد پسندی سے جاہلی افکار و اعمال کا احیاء کرتا ہے۔ اور دینِ خداوندی کو ہوائے نفس کے ماتحت چلانا چاہتا ہے، یا فرق باطلہ کے فاسد عقائد سے عقائد اسلامی اور قرآنی طریقِ اجتماع و سیاست میں تزلزل رونما ہونے لگتا ہے تو ساتھ ہی ایک پراسرار قوت روحانی کا حامل مردِ مجاہد بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جو اپنی بے پناہ قوتِ عمل سے پرستارانِ باطل کے تمام منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے۔ اور دین خداوندی کو سالہا سال کی آمیزشوں سے پاک کرکے تجدیدِ ملت اور احیاءِ دین کے کٹھن مراحل کو ایک محدود عرصہ ہی میں طے کر جاتا ہے ؎

دگر قومے کہ ذکرِ لاالہ آتش
برآورد از دلِ شب صبح گاہش

شناسد منزلش را آفتابے
کہ رنگ کہکشاں روبد ز راہش
(اقبالؒ)

یہ ہے وہ حقیقتِ باہرہ جو اسلامی تاریخ کے ہر دور میں آپ کو نمایاں نظر آئے گی اور کیوں نہ ہو کہ خود سید الاولین و الآخرین صلعم نے اس حقیقتِ کبریٰ کو ان الفاظ میں ظاہر فرما دیا تھا۔

ان اللہ یبعث لھذہ الأمۃ علی رأس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا ۔ (اخرجہ ابو داؤد والحاکم فی المستدرک والطبرانی والبیہقی فی سننہ)	اللہ تعالےٰ اس امت کے لئے ہر سو سال کے خاتمہ پر کوئی ایسی جامع شخصیت بھیجے گا جو اس اُمت کے دین کی تجدید کرے گی ۔

یہ بحث اگرچہ ایک مستقل موضوع رکھتی ہے۔ اور اس کے تفصیلی گوشے ہمارے موضوع سے غیر متعلق ہیں ۔ مگر اجماع اسلامی کے فساد و اختلال کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے علے وجہ التبعیت اس کا ذکر بھی آجانا لازمی ہے ۔

قریباً نصف صدی کے اس دورِ ضلالت و ملوکیت کے بعد خدائے قدوس نے بنی اُمیہ سے ہی ایک جلیل القدر شخصیت حضرت عمر ابن عبد العزیز کو مجددیت کے منصب پر فائز فرمایا۔ آپ نے سب سے پہلا

کام یہ کیا کہ وراثت و جانشینی کے اُس جاہلی تصوّر کو مٹایا اور مجمع عام میں اعلان فرمایا۔

ایہا الناس انی اُبتلیت بھذا الامر من غیر رایٍ منی ولا طلبةٍ ولا مشورةٍ من المسلمین وانی قد خلعت مافی اعناقکم من بیعتی فاختاروا لا نفسکم غیری	اے لوگو! مجھے میری رائے اور خواہش۔ نیز عام مسلمانوں سے مشورہ کئے بغیر ہی حاکم بنا دیا گیا ہے۔ اور اب میں اپنی بیعت سے تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ اور میرے سوا جس کو چاہو اپنا امیر بنا لو۔

چنانچہ اسلامی طریق انتخاب سے ان کو ہی خلیفہ چنا گیا۔ اور اس طرح ملوکیت کا بت ان کے ہاتھوں سے چور چور ہو کر رہ گیا۔

اس کے بعد تجدید دین اور احیاء ملّت کا کام شروع کیا۔ کتاب و سنت کے علوم کی طرف خاص توجّہ کی گئی۔ اسی زمانہ سے احادیث کی ترتیب و تدوین کی مہم شروع ہوئی ثقافت و تہذیب اسلامی کو غیر اسلامی آمیزشوں سے پاک کیا گیا، نظام تعلیم و تربیت اور فکر عامہ میں از سر نو اسلامی طرز کا انقلاب رونما ہونے لگا اور تمدن کے تمام شعبوں کی کتاب و سنت کے مطابق تعمیر ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جاگیردارانہ نظام کا قلع قمع کر دیا گیا۔ شاہی خاندان میں جس قدر جاگیریں

تھیں وہ بیت المال کی ملکیت قرار دی گئیں، شاہ وگدا، امیر وغریب اور دیگر نسلی، وطنی اور قومی امتیازات کو مٹا کر از سرِ نو مساواتِ عامہ، حریت اجتماع اور آزادئی فکر کو رواج دیا گیا۔ مگر افسوس کہ یہ کام ابھی تشنۂ تکمیل ہی تھا کہ عمر ثانی کی عمر نے وفا نہ کی اور آپ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے۔

اب مجدد اوّل کی وفات کے بعد مستقل طور پر عنانِ اقتدار جاہلیت کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ اور پھر آج تک دنیا کے کسی حصہ میں کوئی پائیدار اسلامی طرز کی حکومت قائم نہ ہو سکی، چونکہ مذہب اور اقتدار دونوں قوتیں لازم و ملزوم ہیں اس لئے تاوقتیکہ یہ دونوں یک لخت کسی جامع شخصیت کے ذریعہ عمل پذیر نہ ہوں۔ دنیا میں نظم و امن کا قیام دشوار ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہے۔

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند
کائنات زندگی را محور اند (اقبالؒ)

مگر اب اقتدار نے مذہب سے پیچھا چھڑا لیا اور جاہلیت کے راستہ میں اب کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ چنانچہ اب اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مختلف راستوں سے ملت اسلامیہ پر یلغار شروع کر دی۔ ہر نئے دور میں ایک نیا روپ بدل کر سامنے آئی اور جسدِ ملی میں اس کا اثر و نفوذ بڑھتا ہی چلا گیا۔ مگر حضرتِ مجدد اوّل نے اپنے ڈھائی سالہ دور خلافت میں فکر اسلامی کو جس سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس کے دور رس نتائج کو روک دینا کسی کے بس کی بات نہ تھی، اب ایک طرف جاہلیت کی قوتیں معروفِ کار تھیں اور دوسری طرف مجدد اوّل کی نہضتِ علمی اور حرکت دینی

اپنا رنگ دکھا رہی تھی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

بنی اُمیہ کا دورِ استبداد ۱۳۲ھ تک قائم رہا۔ اس عہد میں بہت سی اسلامی شخصیتیں پیدا ہوئیں جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ (پیدائش ۸۰ھ وفات ۱۵۰ھ) اور حضرت امام مالکؒ (پیدائش ۸۵ھ وفات ۱۷۹ھ) فکر و اجتہاد اور تبحر علمی کے اعتبار سے ممتاز درجہ رکھتے ہیں مگر مصیبت یہ تھی کہ سلاطین و امراء کے فکر و ذہن کو جاہلیت نے اس قدر ماؤف بنا دیا تھا کہ اب وہ فکر اسلامی سے بالکل تہی دست ہو چکے تھے۔ اور کتاب و سنت کی اصل روح کو ہوائے نفس کے تہ در تہ پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ اب اگر کوئی مردِ خدا ان پردوں کو ہٹا کر روحِ اسلامی کو بے نقاب کرنا چاہتا تو ملوکیت کی تمام طاقتیں اس کے خلاف صف آرا ہو جاتیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت سے لے کر اس وقت تک جاہلیت کے جتنے کارنامے ہیں ان میں یہ رنگ زیادہ نمایاں رہا ہے۔ امراء کو کچھ ایسے علماء مل جاتے تھے جو بندگان حرص و آز اور طالبان سیم و زر تھے۔ ان کی زبان سے اہل حق پر کفر کے فتوے لگوائے جاتے۔ اور پھر ان کو قید و بند میں ڈالا جاتا۔ کوڑوں سے پیٹا جاتا۔ قتل کی دھمکیاں دی جاتیں اور وہ سب کچھ کیا جاتا۔ جو اہل حق کے ساتھ اعلاء کلمۃ الحق کے صلہ میں ارباب جور کی طرف سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان مردانِ خدا نے اس راہ میں خون

وطمع کی تمام زنجیروں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ قید و بند کی صعوبتیں اور کوڑوں کی بارش بھی ان کے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

اور دولت و ثروت اور جاہ و عزت کے مژدے بھی سنائے گئے مگر ان مردانِ راہ حق کو کوئی چیز جادہ مستقیم سے نہ پھیر سکی۔

یہ دونوں جلیل القدر امام بنو امیہ کے عہد میں پیدا ہوئے۔ اور عہد عباسی میں ان کی وفات ہوئی۔ یہی وہ مقدس نفوس تھے۔ جن کی طبع رسا اور نظر حق شناس نے قرآن و حدیث کے غوامض و اسرار کو آشکارا کیا اور فکر و اجتہاد اور اخذ و استنباط کے ذریعہ احکام و شرائع، قوانین سیاست اور نظام اجتماع و تمدن مرتب کیا۔

یہ دونوں اصحاب عملی سیاسیات اور ارباب سیاست سے الگ تھلگ رہے اور ان کی علمی کاوشیں کسی امیر و سلطان کی رہین منت نہ ہوئیں بلکہ ان کی طبع غیور نے انہیں سلاطین کی منت پذیری سے ہمیشہ بے نیاز رکھا۔ کئی سلطنتیں بنیں اور بگڑیں، کئی انقلاب آئے سلاطین کی باہم رقابتوں نے خدا کی زمین کو تہ و بالا کر دیا مگر یہ مردانِ حق شناس اپنے مقام و موقف پر قائم رہے۔

جہاں تک ملکی سیاسیات کا تعلق ہے ان دونوں حضرات کے متعلق صرف

اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے۔ کہ مدینۂ منورہ میں جب حضرت امام حسنؓ کے پڑپوتے محمد مہدی نے خلافت کا دعویٰ کیا تو منصور عباسی کی ایک بہت بڑی فوج نے مدینہ پر چڑھائی کر دی محمد مہدی کے پاس تھوڑی سی فوج تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ کامیابی کی کوئی اُمید نہیں تو انہوں نے اپنے لشکریوں سے فرمایا کہ جو لوگ اپنی جان بچانا چاہتے ہیں وہ اپنے اپنے گھروں میں چلے جائیں اب صرف تین سو شہسوار رہ گئے مگر خاندان سادات کے چشم و چراغ محمد مہدی کی تلوار نے ایک سو بہادروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ مگر آخر شکست کھائی۔ اس لڑائی میں امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے محمد مہدی کا ساتھ دیا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر ان حضرات کو سخت سزائیں دی گئیں امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں ان کو زہر دلایا گیا اور مالکؒ کے کوڑے لگائے گئے اور ان کی مشکیں کسی گئیں۔ یہاں تک کہ ایک بازو بھی ٹوٹ گیا۔

غرض ۱۳۲ھ سے عباسیوں کا دورِ امارت شروع ہوا۔ اور بدقسمتی سے یہ لوگ امراء بنی امیہ سے بھی گئے گزرے تھے۔ اور اس کے ساتھ اس دور میں جاہلیت نے یک لخت ہی کئی روپ دھار لئے۔ امراء نشہ اقتدار میں بدمست تھے لادینی اور لامذہبیت کا ایک تلاطم خیز سمندر اُمڈ آیا اور اسلامی نظامِ فکر و عمل پر ہر طرف سے یورش ہونے لگی

خاندانِ سادات کے چھٹے امام حضرت امام جعفر صادقؒ تک شیعہ فرقہ میں اتحاد رہا۔ مگر ان کے بعد یہ فرقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک

بڑا گروہ حضرت موصوف کے بڑے بیٹے حضرت امام کاظمؑ کو امام ماننے لگا اور کچھ لوگ ان کے دوسرے بیٹے اسمٰعیل کو امامت کا حقدار تسلیم کرنے لگے ثانی الذکر گروہ اسماعیلی فرقہ کے نام سے موسوم ہُوا۔ اور یہ گروہ پھر دو گروہوں میں منقسم ہوگیا۔ ایک گروہ وہ تھا جو اپنے عقائد لوگوں سے چھپاتا تھا اور اندرونی طور پر اپنے خیالات کی اشاعت و تبلیغ میں مصروف تھا یہ گروہ باطنی فرقہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس گروہ نے سارے ملک میں تبلیغ کا وسیع جال پھیلا دیا تھا۔ اور دوسرا گروہ جو قرمطی کہلاتا تھا وہ اگرچہ اتنا منظم نہ تھا۔ مگر اس کے ماننے والے بڑے دلیر اور بہادر تھے۔ علم کلام میں ان فرقوں کے عقائد پر بحث کی گئی ہے۔ ان کا مذہب دراصل اسلام اور مجوسیت سے مرکب تھا کیونکہ یہ لوگ ایرانی الاصل تھے اس لئے ایران کے قدیم مذہب، اور تہذیب و تمدن کا ان کے خیالات پر گہرا اثر تھا۔

باطنی فرقہ کا بانی ایک شخص عبداللہ ابن میمون قداح نامی تھا۔ اس نے بیت المقدس میں اپنی تبلیغ کا وسیع سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور اپنے آدمی جگہ جگہ بٹھائے ہوئے تھے۔ جو کبوتروں کے ذریعہ اس کو خبریں پہنچاتے تھے۔ اس بنا پر لوگ اس کے معتقد ہو گئے تھے۔

ان فرقوں کے علاوہ فرقہ معتزلہ نے بھی اسی دور میں عروج حاصل کیا یہ لوگ ایک نئے فلسفیانہ مذہب کے موجد تھے اور انہوں نے دین و دنیا میں دل کھول کر تحریف کی، یہاں تک کہ فکر اسلامی کی پوری عمارت کو

متزلزل کر دیا۔ اور پھر بات یہیں تک ختم ہو جاتی تو خیر تھی۔ مگر اس سے بڑھ کر جاہلیّت نے ان لوگوں پر بھی دست درازی شروع کر دی جو اہل السنت کہلاتے تھے۔ اور علم و فضل میں کمال رکھتے تھے۔ انہوں نے ان نئے فرقوں کے دفاع و مقابلہ کے لئے اسی قسم کے جاہلی ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ اور یونانی فلسفہ کے اوہام اور خرافات کو افکار اسلامی کے ساتھ مخلوط کر دیا چنانچہ اس عہد کی کتب تفسیر اور دیگر اسلامی لٹریچر بھی ان نئے خیالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مگر اس دورِ جاہلیّت میں بھی اللہ کے کچھ بندے پیدا ہوئے جنہوں نے جاہلیّت کے اس بے پناہ ہجوم کا پامردی سے مقابلہ کیا۔ ان میں امام اجل حضرت احمد ابن حنبل، امام شافعی اور امام ابو عبداللہ محمدؒ ابن اسماعیل بخاری رحمۃ اللہ علیہم کے اسماء گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

جاہلیت کا نیا کھیل

اس سے پہلے عرض کر آیا ہوں کہ ملوکیت واستبداد نے جب کبھی اہلِ حق کو کچلنا چاہا تو اہلِ علم میں سے ہی کچھ بندگانِ حرص وطمع کو دولت وجاہ کا لالچ دے کر خریدا اور جو کچھ اُمراء وسلاطین خود نہ کر سکتے تھے وہ اُن سے کرایا اور جس بات کے کہنے کی وہ خود جرأت نہ کر سکتے تھے۔ وہ ان سے کہلوائی۔ اور ان علمبردارانِ شریعت نے اپنے آقایانِ نعمت کے اشاروں پر وقت کے حق پرست لوگوں پر کفر کے فتوے صادر کر کے ان کو طرح طرح کے رنج و بلا میں ڈالا۔ مگر ان کی آواز درا صل ان کی اپنی آواز نہ تھی بلکہ امراء وملوک کی آواز تھی ؎

میں اُن کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان اپنی ہے بات اُن کی

ہمارے لئے اُن مصائب و آلام کا تصوّر بھی صبر آزما حد تک تکلیف دہ ہے۔ جو ان مردانِ راہ حق کو اعلاء کلمۃ الحق کی راہ میں علماءِ سو کے ہاتھوں برداشت کرنے پڑے۔ یہ بہت بڑی افسوسناک اور رنجدہ داستان ہے۔ جس کے سننے کے لئے پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔

حدیثِ دردِ دل آویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چوں درازتر گردد

حضرت امام احمد ابن حنبل (۱۶۴ھ تا ۲۴۱ھ) جن کا نام زبان

پر آتے ہی دل میں عقیدت و محبت کے جذبات امڈ آتے ہیں - ایک بہت بڑے امام حدیث اور مجدّدِ دین تھے - اسلام کے اس بطلِ جلیل اور علمبردارِ علومِ نبوّت کو زندگی کے جن دشوار گزار مراحل سے گزرنا پڑا ہماری طرح کے کمزور و نحیف لوگ اس کا تصوّر بھی مشکل ہی سے کر سکتے ہیں مگر خدا کو جن لوگوں سے کام لینا منظور ہوتا ہے ان کی ذہنی اور جسمانی بناوٹ بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہے -

حضرت امام نے چار عباسی بادشاہوں کا زمانہ دیکھا - اپنے جسمِ اطہر پر ظلم و تشدد کے پہاڑ گرتے ہوئے بھی دیکھے اور پھر عقیدت و محبت کے پھولوں کی بارش بھی دیکھی - یہ دونوں حالتیں اگرچہ صبر شکن تھیں مگر کیا کہنے ان اللہ والوں کے کہ کسی حالت میں اپنے دامنِ بے نیازی کو دنیاوی نجاست سے ملوث نہ ہونے دیا - جن لوگوں نے اللہ کے ساتھ اپنی جان کا سودا کر لیا وہ کسی نفع و سود کے متلاشی نہیں ہوتے -

دل دادم و جاں دادم و ایماں دادم
سود است ولے سود ندانم چیست

غرض ان چار بادشاہوں میں سے مامون، معتصم اور واثق کے زمانہ میں حضرت امام پر شدائد و مظالم کی حد کر دی گئی - انسان تو انسان ہے پہاڑ بھی ان مصائب کی تاب نہ لا سکیں - مگر سرمستانِ خمخانۂ احدیت کے رنگ ہی نرالے ہیں ان کے آہنی عزم کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکی - اور وہ اس دنیا کی فانی لذّات، حیاتِ دنیوی کی پر فریب چمک دمک، شاہوں

کے جلال و جبروت اور طلسم زخارف پر لانت مار کر صرف نصب حیات کی تکمیل میں مصروف سعی رہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مقام بلند اُن خوش بخت اور نیک طالع انسانوں کو ہی میسر آتا ہے۔ جن پر خدائے قدوس کی خاص نظرِ التفات ہوتی ہے۔

بلند مرتبہ زاں خاکِ آستاں شدہ ام
غبارِ کوئے توام گر بہ آسماں شدہ ام

امام موصوف کی نسبت خود ان ہی کے معاصرین نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُن سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ آپ کے عزمِ بلند کے سامنے بادشاہوں کا جاہ و جلال دنیا کی ہر چیز سے حقیر تھا ابراہیم ابن مصعب کوتوال کہتے ہیں کہ میں نے بادشاہوں کے آگے احمد سے زیادہ کسی کو دلیر اور نڈر نہیں پایا۔ ان کے الفاظ ہیں۔

یومئذٍ ما نحن فی عینہ	کار پردازانِ حکومت ان کی نظر میں
الا کامثال الذباب	ایسے تھے گویا سامنے مکھیاں بھنک رہی ہیں۔

بشر حافی جو اس زمانہ کے بہت بڑے عابد و زاہد تھے فرماتے ہیں۔ کہ جب امام احمد کو قید کر کے پا بزنجیر طرطوس روانہ کیا گیا تو ابو بکر احول نے سوال کیا۔ ان عرضت علیک السیف تجیب؟ اگر تم پر تلوار پیش کی جائے تو مان جاؤ گے؟ فرمایا "لا" ہرگز نہیں

بشر حافی سے کہا گیا کہ آپ ان کی سفارش کیوں نہیں کرتے تو فرمایا

مجھ میں ان مصائب کے تحمل کی قوت نہیں۔ قام احمد مقام الانبیاء۔ احمد توانبیاء کے مقام پر کھڑا ہے۔

اس مردِ خدا کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ حسن بن عبدالعزیز نے ہزار ہزار روپیہ کی تیس تھیلیاں آپ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا یہ مال مجھے ترکہ میں ملا ہے اور بالکل طیب ہے۔ آپ اسے قبول فرمائیں تو فرمایا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میرا مالک مجھے رزق دے رہا ہے۔

جب متوکل کا زمانہ آیا تو صورتِ حال بدل گئی ظلم و تشدد کی جگہ انعام و اکرام کی بارش شروع ہو گئی تو یہ دیکھ کر بے اختیار چلا اٹھے۔ ھذا امر اشدّ علی من ذالک یہ عقیدت و محبت کا جال میرے لئے کوڑوں کی مار قید سے زیادہ سخت ہے۔

حضرت امام شافعی (۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ) بھی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے۔ فکر و اجتہاد اور فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں انہوں نے نمایاں کام کیا مگر حکومتِ وقت نے ان کو بھی نہ چھوڑا اور یمن سے بغداد تک انہیں پابہ زنجیر لایا گیا۔

امام بخاری (۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ) کے تفقہ فی الدین اور تبحر علمی سے ساری دنیا روشناس ہے۔ یہ جلیل القدر امامِ حدیث جب فراغتِ علم کے بعد اپنے وطن بخارا تشریف لائے تو حکومتِ بخارا کی طرف سے ان کا شاہانہ استقبال کیا گیا مگر چند دن ہی قیام کیا تھا کہ امیر بخارا ان کی بے نیازی و استغنا اور بے باکانہ تبلیغ سے چلا اٹھا۔ امام بخاری سے مطالبہ کیا کہ آپ شاہی محل

ہیں تشریف لاکر شاہزادوں کو درس حدیث دیا کریں۔ مگر امام صاحب نے جواب دیا ایسا نہیں ہوگا اگر خواہش ہو تو بچوں کو میرے پاس بھیج دیا کرو مگر امیر نے کہا کہ اچھا پھر اتنا ضرور کرو کہ جب میرے بچے تعلیم کے لئے آپ کے پاس آئیں تو اس وقت کسی جولاہے، موچی کا لڑکا وہاں بیٹھنے نہ پائے۔ مگر علوم نبوت کا یہ عالم متبحر اور اسلامی نظام حیات کا شارح یہ کیونکر برداشت کرسکتا تھا۔ کہ ان کے حلقۂ درس میں امیر و غریب اور شریف و ذلیل سے جُدا جُدا سلوک ہو۔ انہوں نے صاف جواب دیا کہ علم حدیث وراثت رسولؐ ہے کسی شاہ و امیر کی جاگیر نہیں یہاں تو شاہ و گدا اور امیر و غریب ایک ہی صف میں بیٹھیں گے اس بات پر امیر سخت ناراض ہوا اور علماء سوء کے توسط سے آپ پر کفر کے فتوے لگائے گئے۔ آخر امام صاحب کو اپنے وطنِ مالوف سے ہجرت کرنی پڑی۔ اور سمرقند کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ جہاں انہوں نے بعد نمازِ عصر بارگاہِ رب العزت میں بصد عجز و نیاز یہ دعا کی۔

اے خداوندا تیرے اس بندے پر زمین کی وسعتیں تنگ آگئی ہیں اب تو اسے اپنے پاس بلالے۔ چنانچہ چند دنوں میں ہی اس دعا نے اثر دکھایا اور آپ نے اسی گاؤں میں فرشتۂ اجل کو لبیک کہی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

غرض عباسیہ کا دور حکومت ۱۳۲ھ سے شروع ہو کر ۶۵۶ھ یعنی پورے پانصد سال تک جاری رہا اور اس کے بعد مصر میں اس خاندان کے کچھ افراد نے ۹۲۳ھ تک حکومت کی مگر دور بنی اُمیہ کے آغاز

میں جس فتنۂ جاہلیت نے سر اٹھایا تھا وہ دن بدن بڑھتا ہی چلا گیا اور دوسری طرف سیاسی اعتبار سے بھی مسلمانوں کا جاہ و جلال تیسری صدی کے اختتام تک زوروں پر رہا مگر اس کے بعد باہم سیاسی اختلاف و نزاع کی وجہ سے اسلامی سلطنتوں کی حالت ناگفتہ بہ حد تک پہنچ گئی۔ بیرونی طاقتیں بھی سر اٹھانے لگیں۔ خلافت عباسیہ کی شوکت ایک افسانہ بن گئی۔ ہسپانیہ کی حکومت کا بھی یہی حال تھا۔ ہندوستان اور دوسرے ممالک میں بھی انتہائی بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ مراکش سے بخارا تک مسلمان ہی مسلمان تھے مگر ان میں کوئی موثر طاقت نہ تھی۔ دوسری طرف قرامطہ کا فتنہ زوروں پر تھا ان حالات میں خدائے قدوس نے کچھ مردانِ حق کو پیدا کیا۔ جنہوں نے اصلاح ملت اور تجدید دین کا بیڑا اٹھایا ان میں ایک حضرت شیخ محی الدینؒ ہیں جنہوں نے چوتھی صدی میں اندرونی اور بیرونی فتنوں کے سدباب کے لئے زبردست کوشش کی۔ تمام دنیا میں اپنے خلفاء کو پھیلا دیا۔ اور ان کی بے لوث کوششوں سے پانچویں صدی میں مسلمانوں کی قوت و شوکت پھر نصف النہار پر پہنچ گئی۔

دوسری طرف امام غزالی رح نے قلمی جہاد کے ذریعہ فلسفۂ یونانی کے بڑھتے ہوئے الحاد اور فرق باطلہ کی فتنہ انگیزیوں کا زبردست مقابلہ کیا۔ اور اپنے مخصوص رنگ میں اسلامی نظریہ حیات کی شرح کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہریت و الحاد کا وہ سیلاب عظیم جو عام مسلمانوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لے جا رہا تھا۔ رک گیا اور صحیح اسلامی فلسفۂ حیات کا رنگ ابھرنے لگا

اسی طرح امام ابن تیمیہؒ جو ساتویں صدی کے ایک بہت بڑے بلند پایہ عالم سنت اور فاضل اجل تھے نے بھی اس زمانہ کے اعتقادی اوہام و خرافات کا نہایت عزم و استقلال سے مقابلہ کیا اور اسلام کے عقائد و افکار اور نظام اجتماع و تمدن میں اس وقت تک جس قدر مشرکانہ اثرات پیدا ہوچکے تھے ان کو ایک ایک کر کے نکالا۔ اور خالص اسلامی نظام فکر و عمل مرتب کیا۔ ان کی فاضلانہ تصانیف نے عالم اسلامی کے اعتقادی ناسور کے لئے نشتر کا کام دیا۔ مگر انہوں نے صرف علمی جہاد پر ہی اکتفا نہیں کی بلکہ اس وقت کی سب سے بڑی قاہرانہ طاقت یعنی تاتاری وحشت کے مقابلہ میں جہاد بالسیف بھی کیا

'لا تنال یغیرا لسیف منزلۃ
ولا تردّ صدورا لخیل بالکتبِ'

غضب یہ ہے کہ یہ تمام مقدس اور پاک ہستیاں علماء سؤ کے فتاوائے کفر کی زد سے نہ بچ سکیں اور وقت کے اربابِ سیاست نے ان کی حق پرستانہ آواز کو کچلنے کے لئے اِن بندگانِ سیم و زر کو ہی آگے بڑھایا حالانکہ یہ ہستیاں اگر نہ ہوتیں تو آج قانون شرعی کے مناہج و طرق، فقہ اسلامی احکام و قضایا کی تفاصیل اور علوم سنت سے ہم بے بہرہ ہوتے۔

گر گفتہ زعشق گہے صرف آشنا
آں ہم حکایتیست کہ از من شنیدہ

ہندوستان میں اسلام وجاہلیت کی ٹکر

اسلام کے دورِ اوّل میں عرب تاجروں کے قافلے ہندوستان میں آئے مالابار اور کالی کٹ کی سرزمین نے سب سے پہلے ان کا خیر مقدم کیا۔ چوں کہ ان لوگوں پر اسلامی نظریۂ اجتماع و مدنیت کا گہرا اثر تھا۔ اس لئے ان کی سادگی، خلوص اور بلند اخلاق نے ان علاقوں کے باشندوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا، دیانت و امانت اور عمل و کردار کی عمدگی کی وجہ سے ان کا اثر و نفوذ اس حد تک بڑھا کہ ہندو راجے بھی ان کو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک ان علاقوں میں اسلامی تہذیب و مدنیّت کا کچھ نہ کچھ اثر پایا جاتا ہے۔ بنی اُمیہ کے زمانہ میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور اس نے ہندو راجاؤں کو شکست دی مگر بنی امیہ کے نزدیک اِن علاقوں کی کوئی زیادہ اہمیت نہ تھی اس لئے محمد بن قاسم کو واپس بلایا۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا قیام محمد غوری کے غلاموں کے ہاتھ سے عمل میں آیا۔ جن کا پہلا حکمران قطب الدین ایبک ۱۲۰۶ء میں تخت نشین ہوا یہ خاندان اصل و نسل کے اعتبار سے ترکی تھا۔ اس وجہ سے اس میں نسلی شرافت، سادگی اور شجاعت و بسالت تو طبعی تھی۔ مگر اسلام نے ان میں عدل و رواداری اور کچھ بلند نظری بھی پیدا کر دی تھی۔ اِس کے بعد کئی خاندانوں نے ہندوستان

پر حکومت کی اور حق یہ ہے کہ دبدبہ و شوکت اور جاہ و جلال کے لحاظ سے ان میں کوئی کمی نہ تھی البتہ اگر ان میں کوئی کمی تھی تو وہ یہ کہ اسلام کی اصل روح سے بہت حد تک نابلد تھے اگرچہ بعض حکمران ایسے بھی ہوئے ہیں جو فطرۃً صالح اور نیک نہاد تھے مثلاً ناصرالدین محمود اور مغل شہنشاہ عالمگیرؒ وغیرہ مگر افسوس کہ صحیح اسلامی نظام سیاست و اجتماع کے نفاذ و اجراء کی ان کو بھی توفیق نصیب نہ ہوئی۔

اس ملک میں اشاعتِ اسلام اور تبلیغ دین کی اگر کوئی کوشش ہوئی تو وہ صرف اولیاء اللہ اور علماء حق کے ذریعہ سے۔ حضرت معین الدین چشتیؒ پیشاور کے راستہ سے آئے۔ لاہور اور دہلی سے ہوتے ہوئے اجمیر کو اپنا مرکز تبلیغ بنایا۔ انہوں نے اپنے خلفاء کو ملک کے کونے کونے میں بھیجدیا خواجہ قطب الدین بختیارؒ کو دہلی میں متعین کیا۔ خواجہ فرید گنج شکرؒ کو پاک پٹن میں اور جلال الدین تبریزی نے بنگال میں اشاعتِ دین کا سلسلہ جاری کیا۔ ان حضرات کی تبلیغی جد و جہد سے ہندوستان میں کسی حد تک شعائرِ اسلامی نے رواج پایا۔

جاہلیّت کا نیا کارنامہ

ہندوستان کی سرزمین ہر بات میں نرالی واقع ہوئی ہے۔ جو بات دنیا کے کسی کونے میں دیکھی اور سُنی نہ جا سکتی ہو اُسے ہندوستان میں دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے امراءِ بنی امیہ ہوں یا شاہانِ عباسیہ، حکومت مصر ہو یا سلطنتِ ترکیہ سب میں ایک امر مشترک ضرور تھا کہ وہ خالص اسلامی فکر و نظر اور طریقِ اجتماع و سیاست سے دانستہ یا نادانستہ طور پر مستغنی تھے اور جاہلی فکر و عمل نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر جمایا ہوا تھا۔ مگر اب تک اتنی بات تھی کہ مسلم قومیت کو ایک متشخص اور مستقل بالذات حیثیت حاصل تھی جس کی بناء صرف اسلام کے بنیادی افکار و اعمال پر تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسلامی فکر و عمل میں بھی ان لوگوں نے بہت کچھ ہیر پھیر کر دیا تھا۔ تاہم برائے نام سہی مگر مسلم قومیت کا داعیۂ اتحاد اب تک اسلامی عقائد و اعمال ہی متصوّر ہوتے تھے۔ مگر ہندوستان کے شہنشاہ اکبر (دی گریٹ امپائرر) نے یہ کسر بھی پوری کر دی اور ایک نئی "ہندی قومیّت" کی بنیاد رکھی۔ اس تصوّر قومیّت نے اسلام کے مخصوص نظامِ اجتماعی کو سخت نقصان پہنچایا اور جسدِ ملّی کے جوڑ جوڑ کو مضمحل کر دیا۔ اس کی پوری تفصیل تو آگے کسی موقع پر آئے گی۔ لیکن یہاں صرف اس قدر عرض کر دینا ضروری ہے کہ مقتضائے "لکلّ فرعون موسیٰ" جب متحدہ قومیّت کا ایک نیا بُت تراش

لیا گیا تو خدا نے اسی جنم بھومی میں ایک مردِ حق بیں کو بھی پیدا کر دیا جس کے عصائے کلیمی کی ایک ہی ضرب سے یہ صنم اکبر پاش پاش ہو کے رہ گیا۔

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہُنر کیا

میری مراد حضرت مجددؒ الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ سے ہے جنھوں نے صرف علمی جہاد ہی نہیں کیا بلکہ وقت کی برسرِ اقتدار۔ طاقت نے آپ کو قید و بند اور ہر قسم کی بلا و آزمائش میں ڈالا۔ مگر ان کے عزم و ہمت میں بال برابر بھی فرق نہ آسکا۔

عشق بازی راتحمل بایداے دلِ عشقباز
گر بلائے بود بود و گر خطائے رفت رفت

عالمگیرؒ کی موت کے بعد سلطنتِ اسلامی حالت نزع میں مبتلا ہو گئی ایک نیم مردہ جسم تھا جس میں مدافعت کی طاقت باقی نہیں تھی۔ مگر مرتے مرتے بھی اس سخت جان نے کافی عمر حاصل کر لی۔ اندرونی خلفشار اور خلاف و نزاع نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ مگر آخری سانس تک افتاں و خیزاں قدم بڑھاتی چلی گئی مگر تابکے؟ آخر گری، تڑپی اور جان دے دی۔

اس آخری دور میں کئی مردانِ حق شناس پیدا ہوئے ان میں حضرت شاہ ولی اللہؒ مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ کے اسماءِ گرامی قابلِ ذکر ہیں ان حضرات نے خالص اسلامی رنگ میں اسلامی نظریۂ حیات کو

بروئے کار لانے کی مجاہدانہ جدوجہد کی ان کی علمی کاوشوں اور سرفروشانہ سرگرمیوں نے اگرچہ وقتی طور پر کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہ کی مگر ملّتِ اسلامی کی تعمیر فکر میں ان کو کافی دخل ہے۔

یہ دور صرف مسلمانانِ ہند کے لئے منحوس نہ تھا۔ بلکہ تمام عالمِ اسلامی ایک خطرناک انقلاب کے دروازے پر کھڑا تھا اور تمام اسلامی سلطنتیں اسی آگ کے شعلوں کی زد میں آگئی تھیں۔

دول یورپ مسلمانانِ عالم کی مرکزیت کو نیست و نابود کرنے کے لئے کس طرح وہ اپنے اس ناپاک مقصد میں کامیاب ہوئیں؟ یہ تاریخ عالم کا ایک افسوسناک باب ہے جس کے لئے الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر اس سے زیادہ افسوسناک خود مسلمانوں کا نامۂ اعمال ہے جس پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔ اغیار کی ریشہ دوانیاں تو زمانۂ رسالت سے جاری رہیں۔ مگر جب تک مسلمانوں کا قومی کردار مضبوط و مستحکم رہا اس وقت تک وہ ہر بیرونی طاقت کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے۔ اور جو طاقت ان سے ٹکرائی وہ خود پاش پاش ہو کر رہ گئی۔ مگر دنیائے اسلام کے لئے وہ منحوس ترین دن تھا۔ جب کہ پہلی دفعہ ملّت اسلامیہ کی بنیان مرصوص میں رخنہ پیدا ہوا۔ یہی وہ خطرناک فتنہ تھا جس کی نسبت خود آنحضرت صلعم نے پہلے سے خبر دی تھی۔

التی تموج کموج البحر (بخاری) جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مارتا ہوا آئیگا اور مسلمانوں کے قومی کردار کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جائے گا۔ مگر پھر بھی جب تک مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ میں اسلامی فکر و عمل کا کم سے کم حصہ

بھی موجود رہا تمام دنیا پر فرمانروائی کرتے رہے ان کی افواج نے دنیا کا چپہ چپہ چھان مارا اور جو لوگ اسلامی جھنڈے کو سرنگوں کرنے کے لئے آگے بڑھے وہ خود ہی اس کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ مگر انیسویں صدی کے اوائل میں دنیائے اسلام کو ایسے سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ ان کی تاب نہ لا سکے۔ لیکن نہایت رنج و افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ عالم اسلامی کی تباہی و بربادی میں اغیار کی فتنہ انگیزیوں کو اتنا دخل نہیں جتنا کہ غدارانِ ملت کی دسیسہ کاریوں کو ہے۔

من آنچہ دیدہ ام ز دل و دیدہ دیدہ ام
گاہے ز دل کنم گلہ گاہے ز دیدہ ام

اس سلسلہ میں اسی زمانہ کے بطلِ جلیل، اور مدبرِ اعظم علامہ جمال الدین افغانیؒ کے ایک مضمون کا ترجمہ ذیل میں درج کرتا ہوں جس سے اندازہ ہو سکے گا۔ کہ اس زمانہ میں دنیائے اسلام کن مصائب سے دوچار ہو رہی تھی۔ اور ان مصائب کی زیادہ تر ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟

علامہ افغانی کا ایک مضمون

شاہ سلطان حسین کے زمانہ میں روسی جب اصفہان پر حملہ آور ہوئے تو عثمانیوں نے روس کی حمایت کی بلکہ ایران کے مقابلہ میں روس کو امداد بہم پہنچائی گئی یہ کہنا احمقانہ فعل تھا اور انہوں نے اتنا بھی محسوس

نہ کیا کہ روس ترکوں کے ساتھ آج تک کیا معاندانہ سلوک کرتا رہا ہے۔ ترکی مقبوضات مثلاً بلغاریہ، یونان اور رومانیہ میں اس نے کیا ریشہ دوانیاں شروع کر رکھی ہیں۔ نتیجہ یہ ہؤا کہ روس آذربائیجان کے کئی مقامات پر قابض ہو گیا۔

عباس مرزا جب روس کے ساتھ لڑ رہا تھا تو عین اسی زمانہ میں ترکوں نے ایران سے جنگ چھیڑ دی اور اس مداخلت کی وجہ سے روس آذربائیجان کے کئی شہروں پر قابض ہو گیا۔ سلطان ٹیپوؒ کا سفیر دربارِ ترکی میں گیا اور اس نے سلطان کی طرف سے یہ پیشکش کی کہ ہندوستان کے بعض علاقوں کے عوض بصرہ ان کے حوالہ کیا جائے۔ مگر ترکی نے اس پر توجہ نہ دی اور سفیر ناکام واپس آگیا۔ سلطان ٹیپوؒ کا مقصد یہ تھا کہ ترکوں کا ہندوستان میں اثر و نفوذ پیدا ہو جائے اور انگریزوں کی قوت کو توڑا جائے۔ اگر ترک اس وقت اس پیش کش کو مان جاتے تو آج دنیا کا نقشہ شاید کچھ اور ہی ہوتا۔

جس زمانے میں افغانیوں نے ہندوستان کو انگریز کے تسلّط سے نکالنے کی جدوجہد شروع کی۔ ہندوستان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا تو فتح علی شاہ ایران نے انگریز کو خوش کرنے کے لئے افغانستان کو چیلنج کر دیا۔ مگر اس نے اتنا بھی غور نہ کیا کہ افغانیوں کے خلاف انگریز کے ہاتھ مضبوط کرنا خود ایران کے لئے کس درجہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

امیر دوست محمد خان والی افغانستان نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ سے معاہدہ کیا اور پھر انگریز کے طلسم میں گرفتار

ہو کر رنجیت سنگھ کو میدانِ جنگ میں تنہا چھوڑ دیا۔ اگر دوست محمد خان میں کچھ بھی سیاسی شعور ہوتا تو رنجیت سنگھ سے ہر قیمت پر تعاون کرتا کیونکہ پنجاب کی حکومت افغانستان کو انگریزی خطرہ سے محفوظ رکھ سکتی تھی۔

اس طرف ہندوستان میں نواب بنگال اور نواب کرناٹک اغیار کا آلۂ کار بن گئے۔ نواب لکھنؤ نے تیموری سلطنت کو صنعت پہنچایا۔ نواب دکن نے ٹیپو شہید کے مقابلہ میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔

اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے اپنی خود مختاری کے لالچ میں ترکوں سے بغاوت کی اور یورپ کے بنیوں سے گراں شرح سود پر قرضہ لیا۔ اور اس طرح ملک کو انگریز کے ہاتھ بیچ دیا۔

اس مضمون میں علامہ افغانی نے جن دردناک واقعات کا ذکر کیا ہے ان کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دراصل علامہ کی سرفروشانہ سرگرمیاں اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جو عالمِ اسلامی کے لئے انتہائی یاس انگیز دور تھا۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت مسلط ہو رہی تھی۔ ترکی کو تباہ کرنے کے لئے دول یورپ کی دسیسہ کاریاں مسلسل جاری تھیں۔ الجیریا، ٹیونس اور مراکو پر فرانسیسی انقلاب چھا چکا ہے۔ طرابلس۔ اٹلی کے چنگل میں گرفتار تھا اور دوسری طرف روس، بخارا اور آذربائیجان پر قبضہ جما رہا تھا۔ یہ حالات تھے جن سے تمام دنیائے اسلام دوچار ہو رہی تھی۔ اور اس پُرآشوب دَور میں تنہا علامہ افغانیؒ کی آواز بدامنی د

بے چینی کی ان فضاؤں میں گونج رہی تھی۔

اب ظاہر ہے کہ اقوامِ غالبہ جہاں انسانوں کے اجسام پر حکومت کرتی ہیں وہاں ان کے اذہان و افکار کو بھی ایک خاص قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور مفتوح اقوام کے فکری اور ذہنی قویٰ میں وہ نظم و ربط باقی نہیں ہوتا اور نہ ہی اجتماعی احساسات میں وہ قوت موجود ہوتی ہے۔ جو خارجی اثرات کے لئے مانع ہو سکے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ جب تک قوموں کے ذہنی قویٰ میں ربط و تسلسل اور اجتماعی احساسات میں قوت و استحکام موجود رہتا ہے۔ اس وقت تک وہ اغیار کے غلبہ و تسلّط کو قبول ہی نہیں کرتیں۔

چونکہ اس دور میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا اس لئے اقوامِ غالبہ کے جاہلی تصوّرات کو انہوں نے نہایت آسانی کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا۔ اور ان کے نظامِ اجتماع و تمدّن میں اسلامی نظریۂ حیات کا جو تھوڑا بہت اثر باقی تھا وہ بھی زائل ہونے لگا۔ اور مسلمان عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔

آئندہ صفحات میں ہم کتاب و سنت کی روشنی میں ان قومی اور اجتماعی تصورات کا ذکر کریں گے۔ جو دوسری اقوام کے اثر سے مسلمانوں میں نفوذ کر چکے ہیں۔ اور اسلامی نظامِ اجتماع و تمدّن سے اُن کو دور کا واسطہ بھی نہیں

اقوامِ حاضرہ کے نظریّہ ہائے اجتماع

اس سے پہلے کہ عصر حاضر کے نظریہ ہائے اجتماع پر الگ الگ کتاب وسنت کی روشنی میں بحث کی جائے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عمومی نقطۂ نظر سے ان کے داعیات اجتماع پر تبصرہ کر دیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کو دو قسم کی ضرورتیں لاحق ہوتی ہیں۔ مادی اور روحانی لیکن انسان کی عجلت پسندی اور غرض پرستی ہمیشہ مادی ضرورتوں کو روحانی ضرورتوں پر ترجیح دیتی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ صرف اسی نقطۂ نظر کے تحت آج تک انسانی وحدتیں (یونیٹیز) وجود میں آتی رہی ہیں۔ انبیاء ورسل اور ان کے سچے متبعین کے سوا کسی نے ثانی الذکر ضرورتوں کا احساس نہیں کیا اور ظاہر ہے کہ مادی ضرورتوں کا احساس جب حدِ اعتدال سے بڑھ جائے یہاں تک کہ روحانی احساس ان میں گم ہو کر رہ جائے یا مادی تقاضے اس احساس پر غالب آجائیں تو اس حالت کو قرآنِ حکیم نے "ہوائے نفس" اور شہوات سے تعبیر کیا ہے:۔

ولئن اتبعت اھوائھم بعد الذی جاءك من العلم مالك من اللہ من ولیّ و لا نصیرؕ (بقرہ)	اے نبیؐ! اگر آپ یہود ونصاریٰ کی مادہ پرستانہ خواہشات کی پیروی کریں گے تو خدا کے مقابلہ میں آپ کا کوئی دوست اور مددگار نہ ہو گا

فخلف من بعد خلف اضاعوا الصّلوٰۃ واتّبعوا الشھوات (مریم ۶)	ان کے بعد ایسے نالائق خلف پیدا ہوئے جنہوں نے فریضۂ نماز (روحانیات) کو چھوڑ دیا۔ اور شہواتِ نفسانی (مادیات) کی پیروی کرنا شروع کر دی۔
فخلف من بعد ھم خلف ورثوا الکتاب یأخذون عرض ھذا الادنیٰ ویقولون سیغفر لنا (اعراف)	ان کے بعد ایسے لوگ کتاب اللہ کے وارث بنے جو حیات دنیوی کے متاع پر مٹنے لگے اور دعویٰ یہ کہ ہمیں ضرور بخش دیا جائے گا۔

اسلام کی سب سے بڑی خصوصیّت یہی ہے کہ اس نے مادّیت اور روحانیت میں توازن قائم کر دیا جائے اور اس کے فلسفۂ حیات کے تمام اجزاءِ سیاسیات و عمرانیات، اقتصاد و معیشت، تہذیب و تمدن اور مذہب و روحانیت باہم اس طرح مربوط ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ پر قائم رہنا امنِ عالم کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اور اگر اس نظامِ حیات کی کوئی کڑی اپنی جگہ سے ہل جائے تو پوری انسانی زندگی میں اختلال و فساد کا رونما ہونا لازمی ہے۔

لوِ اتّبعَ الحق اھوا ءھم لفسدت السّمٰوات و	اگر حق (خدائی نظامِ حیات) ان کی خواہشات اور خود ساختہ رسم و

الارض و من فیھن (مومنون) — رواج کا تابع ہو جائے تو ساری کائنات کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے

انبیاء و رسل کی بعثت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کے منتشر اجزاء میں از سرِ نو ربط و نظم پیدا کریں اور انسانوں کو افراط و تفریط کی راہوں سے ہٹا کر نقطۂ عدل پر کھڑا کر دیں

ولقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات و انزلنا معھم الکتاب و المیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید) — اور ہم نے رسولوں کو بیّن اور واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان اُتاری تاکہ انسان نقطۂ عدل پر کھڑے ہو جائیں

بلکہ اسلام میں مقصود بالذات اِس عالمِ رنگ و بو سے وراء الورای چند مابعد الطبعیاتی حقایق ہیں جن کی تکمیل کے لئے عالمِ مادی محض واسطہ ہے۔ بالکل اس طرح کہ ایک معمار کو مکان کی تعمیر کے لئے چند مخصوص اوزار کی ضرورت ہے۔ اور یہ اوزار اصل مقصد کے لئے محض ذریعہ ہیں اور خود مقصود بالذات نہیں، اب ظاہر ہے کہ مقصود بالعرض کو مقصود بالذات تصوّر کر لینے سے اجزاءِ حیات میں انتشار پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے اور اسلام اس کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا اسی بناء پر وہ اقوامِ عالم کے مادہ پرستانہ مناہج و طرق کی نہایت شدّت سے مخالفت کرتا ہے۔ اور ان کی جدو

جہد حیات کو ضلالت و گمراہی قرار دیتا ہے۔

ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالًا	کیا ہم آپ کو ان لوگوں کی حقیقت
الذین ضلّ سعیھم فی الحیٰوۃ	بتائیں جو زندگی کی جد و جہد میں
الدنیا وھم یحسبون انھم	خسارہ اٹھا رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں
یحسنون صنعًا	جن کی سعی و کوشش صرف مادی ضرورتوں
(کہف)	کی تکمیل میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ اور پھر

بھی وہ یہی سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیابی کی
منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اور صرف اسی پر بس نہیں بلکہ قرآنِ کریم ان کے منافی فطرت عزائم
کے ہلاکت انگیز نتائج سے ان کو متنبہ کرتا ہے۔

وکاین من قریۃٍ عتت عن	کتنی بستیاں تھیں جنھوں نے اپنے
امر ربّھا ورسلہ فحاسبناھا	پروردگار اور اس کے رسولوں سے
حسابًا شدیدًا وعذبناھا	سرکشی کی پس ہم نے ان کا سخت
عذابًا نکرًا	محاسبہ کیا اور ان کو سخت عذاب میں ڈالا
(طلاق)	

وکذٰلک اخذ ربّک اذا	آپ کے رب کی پکڑ ایسی ہی ہے
اخذ القریٰ وھی ظالمۃ	جبکہ وہ ظالم بستیوں کو پکڑتا
ان اخذہ الیم شدید	ہے۔ اس کی پکڑ دردناک اور بہت
(ہود)	سخت ہے۔

کسی چیز کو اس کے اصلی مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینے کا نام ظلم ہے اور قرآن حکیم کے مطالعہ سے یہ بات ابھری ہوئی نظر آتی ہے۔ کہ اس نے اقوام عالم کی تباہی و بربادی کا سبب تنہا ظلم کو ہی قرار دیا ہے۔

وما ظلمناھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون — ہم نے ان قوموں پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتی رہیں (نحل)

یہی وجہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ اولین اس عالمِ رنگ و بو کی رعنائیوں سے آگے نکل کر ایک دوسرے عالم جاودانی کا مشاہدہ کرتی ہے اور مردِ مومن کے لئے دنیاوی لذات و شہوات میں الجھنا اس کی حقیقی موت ہے لیلیت وطنیت، قومیت اور معاشی تقاضے اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے بلکہ اس کی جدوجہد کا نقطۂ مرکز انسانیت کبریٰ کا منتہائے کمال ہے

عقل خود بیں دگر و عقل جہاں بیں دگر است
بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہین دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک
آنکہ گیرد خورش از دانۂ پروین دگر است
(اقبالؒ)

دنیا کی غلاظتوں اور جسم کی راحتوں کے لئے لڑنا دوسری قوموں کا شغل ہے اور مسلمان اعلاء کلمۃ الحق کے سوا کسی دوسرے مقصد کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھانا چاہتا۔ بلکہ وہ زخارف دنیوی اور جاہ و اقتدار

کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی اپنی شانِ استغنا کے خلاف تصور کرتا ہے۔
اور اس کا "فقرِ غیور" دنیا کی ہر چیز سے اسے بے نیاز رکھتا ہے۔

ولا تمدن عینیک الی ما

متعنا بہ ازواجاً منھم زھرۃ	ہم نے اہلِ کفر کو دنیاوی زیب
الحیٰوۃ الدنیا لنفتنھم فیہ	زینت کے جو مختلف النوع سامان
ورزق ربک خیرٌ وابقی	دے رکھے ہیں اے نبیؐ آپ اُن کی طرف
(طٰہٰ)	نظر اُٹھا کر بھی نہ دیکھیں ان چیزوں

کے ذریعہ ہم ان کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ آپ کے لئے آپ کے
پروردگار کا دیا ہوا رزق ہی بہتر اور پائیدار ہے۔

مگر اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے نظرِ حق شناس اور طبع ذوقِ آشنا کی
ضرورت ہے۔ یہ مادہ پرست تو ہیں اس بادۂ رنگین کی سرمستیوں کا تصور
بھی نہیں کرسکتیں ؎

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

اقوامِ حاضرہ کا جہادِ قومی اور جہدِ ملی وطنیت کی چار دیواری ہیں محدود
اور قوم اور نسل کے علائق سے بندھا ہوا ہے یا ان کے پیٹ کی کمینہ
خواہشات ان کو جنگ و قتال پر آمادہ کرتی ہیں بلکہ وطن، نسل، ثقافت
معاشی تقاضے اور اس قسم کے مادی اور عارضی تصورات ہی ان کی ہئیاتِ
ترکیبہ اور اجتماع اور مدنیت کی تخلیق کرتے ہیں۔ مگر مسلمان ان چیزوں میں
سے کسی کے لئے اپنے اندر کوئی کشش نہیں محسوس کرتا۔ اس کی قومیت کی

بناء وطنیت و قومیت، نسل اور معیشت کا صنم باطل نہیں بلکہ نظریۂ توحید و رسالت ہے

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دینِ ما ایمانِ ما
مسکنِ یار است شہر یار من
پیش عاشق این بود حب الوطن

(اقبالؒ)

اس بناء پر مسلمان کا جہاد ملی بھی دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ مادی ضرورتوں کا احساس اسے ہرگز جنگ و قتال پر آمادہ نہیں کرتا۔ اگر اسے اقتدارِ حکومت کی ضرورت ہے تو صرف اس لئے کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے دینی مقاصد کو بروئے کار لا سکتا ہے۔ ورنہ حصولِ اقتدار بھی اس کے نزدیک صنم باطل بن کے رہ جاتا ہے۔

الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت (آیہ)	اہل ایمان صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ اور اہلِ کفر شیطان کی راہ میں
عن ابی موسیٰ قال جاء رجل النبی صلعم فقال یا رسول اللہ فان احدنا یقاتل غضبنا	ایک شخص نے نبی کریم صلعم سے عرض کیا یا رسول اللہ ہم میں سے کچھ لوگ غضب و انتقام کے طور پر

ویقاتل حمیۃ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ

(بخاری)

اور کچھ دوسرے قومی یا ملکی عصبیت کے لئے لڑتے ہیں تو آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ جو اعلاء کلمۃ الحق کے لئے لڑے گا صرف اسی کا جہاد، جہاد فی سبیل اللہ متصوّر ہوگا

غرض وطن ہو یا قوم، نسل ہو یا قبیلہ، خود ساختہ شعارِ قومی ہو یا داعیہ معشیت و اقتصاد، ان میں سے ہر چیز اسلام میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے اور اصل مقصد کے حصول کے لئے صرف آلہ کے طور پر کام آسکتی ہے۔ اگر اسے رکنِ اوّل کی جگہ دے دی جائے۔ اور اصل مقصد کو پیچھے ڈھکیل دیا جائے تو اسلامی فلسفۂ اجتماع کی پوری عمارت متزلزل ہو کر رہ جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کے نزدیک ہر وہ چیز صنم باطل کی حیثیت رکھتی ہے۔ جو اُس نے اصل مقصد سے ہٹا کر اپنی جانب پھیرلے۔

مگر اس سلسلہ میں اقوامِ حاضرہ کے نقطہ ہائے نظر بالکل الگ ہیں۔ جو چیزیں ہماری نظر میں سب سے آخری جگہ پاتی ہیں وہ ان کی نظر میں سب سے اوّل مقام رکھتی ہیں بلکہ ان کی نگاہ میں ان حقیر مادی مقاصد کے سوا کوئی دوسرا مقصد ہی نہیں۔ ان کے فلسفہ ہائے اجتماع میں اخلاقی اقدار کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جغرافی حد بندیاں قبیلوی اور نسلی عصبیت، خود ساختہ طرزِ تمدن اور معاشی شرکات ان کی قومیتوں کے بنیادی پتھر ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا ؟ کہ یہی وہ چیزیں ہیں۔ جو امنِ عالم کے لئے مستقل خطرہ

بنی ہوئی ہیں اور موجودہ عالمگیر شورش و اضطراب کا سرچشمہ ہیں۔ کیونکہ یہی وہ مادّی تصوّرات ہیں جو عالمگیر اخوّتِ انسانی کو ہزارہا متضاد اور متخالف گروہوں میں تقسیم کرنے کے ذمّہ دار ہیں، وطنیّت کا اقتضاء یہ ہے کہ جغرافی حدبندیوں کے اعتبار سے سینکڑوں انسانی وحدتیں وجود میں آئیں، رنگ و نسل، رسم و رواج اور مخصوص تمدّنی شعار بھی اسی طرح نوعِ انسانی کو کئی متضاد قومیتوں میں تقسیم کرتے ہیں، اور داعیاتِ معیشت کا بھی یہی حال ہے۔ کیونکہ ہر انسانی طبقے کا معاشی مفاد دوسروں سے نہ صرف الگ ہے۔ بلکہ اکثر حالات میں متصادم ہوتا ہے غرض ان تمام تصوّرات کا ردِّ عمل نفرت و غیرت، حقارت و تذلیل تسلّط و استیلا جلبِ دولت اور اقتصادی تفوق و برتری کا حصول ہے اور چونکہ ہر ایسی قومیّت میں یہ کمینہ جذبات نہایت سرعت کے ساتھ پرورش پا رہے ہیں ۔ اس لئے اس کا قدرتی نتیجہ انسانوں کے ان متخالف گروہوں میں باہم ہلاکت انگیز تصادم کی شکل میں رونما ہو رہا ہے ۔ اور موجود شورش و بدامنی کا پسِ منظر یہی کمینہ جذبات ہیں ۔ جو حریّت و مساوات اور آزادیٔ وطن کے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن کر نوعِ انسانی کی مشکلات میں اضافہ کر رہے ہیں ۔

گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد کئی امن کانفرنسیں ہوئیں، قیامِ امن کے لئے ہزاروں تجاویز زیرِ بحث لائی گئیں ۔ آئندہ جنگ کے خطرات کو روکنے کے لئے ہر قوم کے بڑے بڑے مدبر لگاتار کوششوں میں مصروف

نظر آتے ہیں اور بظاہر ہر قوم دوسری قوموں کے خدشات کو دور کرنے کی انتہائی جدوجہد کر رہی ہے۔ مگر اندر ہی اندر آئندہ جنگ کی تیاریوں میں بھی منہمک ہے کیا ان حالات میں قیام امن کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو پھر عقل و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ یہ لوگ امن کی کانفرنسیں اور تحدید اسلحہ کی بے سود کوششیں چھوڑ کر اس عالمگیر شورش و اضطراب کے اصل سرچشمہ کی ٹوہ لگائیں اور عوارض مرض سے اپنی توجہ ہٹا کر اصل سبب مرض کی تشخیص میں مصروف سعی ہو جائیں یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ اصل جراثیم بدستور پرورش پاتے ہیں اور مرض کا خاتمہ بھی ہو جائے یا ان جراثیم کی بیخ کنی کرنے اور مریض کو ان کی ہلاکت خیزیوں سے بچانے کے بجائے افیون کے انجکشنوں سے اسے بے ہوش کر دیں اور پھر دنیا پر یہ ظاہر کرنا شروع کر دیں کہ مریض اب رو بصحت ہے اگر آپ اس مرض کا بالکلیہ ازالہ چاہتے ہیں تو سب سے پہلے آپ کو اجتماع و تمدن کے ان فاسد نظریوں کو تبدیل کرنا ہوگا اور اسلام کے صالح نظام اجتماع میں پناہ لینی ہوگی۔

اسلام ایک ایسے طرز اجتماع و تمدن کا بانی ہے جس کی عمارت پائیدار مضبوط اور مستقل بنیادوں پر قائم ہے یعنی اسلامی نظام اجتماع جن تصورات پر مبنی ہے وہ ایسے ازلی اور ابدی حقایق ہیں کہ رنگ و نسل کے ناپائیدار علائق، وطنیت کی مصنوعی حد بندیاں اور معاشی تقاضے ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتے اور نہ ہی زمانہ کے انقلاب و تغیر کو ان میں کوئی دخل ہو سکتا ہے

بلکہ اس کے برعکس یہ الٰہیاتی نظریئے حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ پر اثر انداز ہوتے ہیں اور پوری زندگی کو ایک خاص رنگ میں رنگ دیتے ہیں۔

زمانۂ حاضر کے نظریئہ ہائے اجتماع صرف مادی ضرورتوں کی پیداوار ہیں اور ان کا وجود و بقاء ان مادی احساسات کا تابع ہے اس لئے ان کو کوئی پائیدار اور مستقل حیثیت حاصل نہیں بلکہ احوال و ظروف کے پیمانہ کے ساتھ بدلتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ ان مادی احساسات کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فلسفہ ہائے اجتماع کا کوئی معین دائرہ عمل نہیں جو ان کے طرزِ اجتماع میں ربط و تسلسل پیدا کر دے نیز یہ وطنی، نسلی، ثقافتی اور اقتصادی قومیتیں اپنے جداگانہ تشخصات کی وجہ سے من کل الوجوہ باہم متغائر ہیں اور کوئی امر ان میں وجہِ اشتراک نہیں، ہر قومیت اپنے علیحدہ تشخص کو جو اُسے ایک محدود خطۂ ارضی میں بسنے یا لسانی اور معاشرتی خصوصیات یا رنگ و نسل کے علائق یا معاشی مقتضیات کی وجہ سے حاصل ہے کے تحفظ و بقاء ہی کو زندگی کا آخری نصب العین تصور کرتی ہے اور ہر ایسی جد وجہد کو وہ اپنے لئے ذریعۂ نجات تصور کرتی ہے جو ان ناپائیدار احساسات کو اُبھارنے اور ان عارضی قومیتوں کی برتری کے لئے عمل میں لائی جائے چنانچہ دورِ حاضر کی تمام قومیتوں کا یہی حال ہے ایسی حالت میں کوئی ہمہ گیر صداقت (یونیورسل ٹروتھ) ان کے مدِنظر نہیں رہ سکتی۔ اور نہ ہی یہ قومیتیں ان عالمگیر صداقتوں اور الثابتت مطلقہ کے مقتضیات کی جانب توجہ دے سکتی ہیں۔ کیونکہ ان کے فلسفہ ہائے

اجتماع کی بنیاد ہی چند ایسے مادی نظریات پر قائم ہے جو کسی طرح نوعِ انسانی کے تمام افراد میں وجہ اشتراک نہیں بن سکتے۔ بلکہ اس کے برعکس ان میں ہر طرح کا تضاد پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر قوم اپنے سیاسی اور اقتصادی تفوق کے حصول میں سرگرم نظر آتی ہے اور روحانی تصورات یا اخلاقی اقدار کی ان کے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں۔

اسلامی فلسفۂ حیات کی پوری عمارت چونکہ الہیاتی تصورات اور اخلاقی اقدار پر قائم ہے۔ اس لئے اس کے ہر جزو میں ایک ہی روح کارفرما ہے۔ اور وہ ایک ہی چیز اسلام کے نظام تمدن و تہذیب کا نقطۂ مرکز ہے۔ اور اس الہیاتی نظام کے تمام اجزاء اسی مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور
اللہ و قولوا قولاً سدیداً	سچی بات کہو اس سے تمہارے اعمال
یصلح لکم اعمالکم (الآیۃ)	زندگی میں اصلاح و نظم پیدا ہوگا۔

اس "تقویٰ" کا اولین ردِ عمل اسلامی ضابطۂ اخلاق کی پابندی اور انسانی اعمال کی اصلاح و تنظیم کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ اور اسی سے عملی جدوجہد کی راہیں نکلتی ہیں

اقوام حاضرہ کا نظامِ فکر اور دستورِ اخلاق خارجی حالات اور کائناتی تبدیلیوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے، معاشرہ اور طرزِ اجتماع کی انقلابی حالتوں کے ساتھ ساتھ ان کا فکر و ذہن بھی بدلتا چلا جاتا ہے۔ موجودہ

مفکرین نے اس نظریہ کو مستند تسلیم کیا ہے کہ دماغ ایک آلۂ خیال ہے اور اس کی ہر داخلی کیفیت خارجی اثرات کا نتیجہ ہے گویا ان کے نزدیک ذہنی اور فکری ارتقاء کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کی اندرونی قوتیں بیرونی احوال و نتائج کی پابند و تابع ہو جائیں چنانچہ ماہر حیاتیات ہربرٹ سپنسر نے اخلاقیات کی تعریف یہ کی ہے کہ ہر وہ کام اخلاقی ہے۔ جو انسان کی داخلی کیفیات کو خارجی احوال و ظروف پر منطبق کرنے میں مدد دے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسانوں کے خارجی حالات اگر عالم انسانی کو تباہی و بربادی کی طرف لے جا رہے ہوں تو فکر و ذہن کی قوتیں بھی ان حالات کے ساتھ مل کر تباہی کو قریب تر لانے میں مدد دیں تاکہ دماغ کی اس اطاعت شعاری کو اخلاقیات کے دائرہ میں موزوں جگہ مل سکے۔ کبرت کلمۃً تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذباً

اسلام کا نقطۂ نظر اس بارے میں اس کے بالکل برعکس ہے یعنی اسلام کے مابعد الطبیعاتی نظریات ایک مخصوص طرز تمدن اور دستور اخلاق کی تخلیق کرتے ہیں اور ان نظریات کی ارتقائی حرکت کے ساتھ ساتھ اجتماع و تمدن اور اخلاق کے دوائرہ بھی بدلتے جاتے ہیں اور نظام تمدن اور دستور اخلاق کا حسن و قبح اور صلاح و فساد داخلی کیفیات کا رد عمل (ری ایکشن) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے ایمان کو ہر جگہ عمل صالح سے مقدم رکھا ہے۔ اور ایمان باللہ کو پورے نظام فکر و عمل کے لئے مرکز و محور قرار دیا ہے۔

من عمل صالحًا من ذکر او انثی وھو مومن فلنحیینّہ حیوۃً طیبۃً (آیہ)	مرد ہو یا عورت جو بھی نیک کام کریگا بشرطیکہ وہ مومن ہے۔ اس کی زندگی کو نفیس اور پاکیزہ کر دیں گے۔

اور احادیث نبوی سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے

عن سفیان بن عبداللہ الثقفیؓ قال قلت یارسول اللہ قل لی فی الاسلام شیئًا لا اسئل عنہ احدًا بعدک قال قل اٰمنت باللہ ثمّ استقم (رواہ مسلم)	سفیان ابن عبداللہ ثقفی کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ اسلام میں کوئی ایسی بات بتا دیں کہ آپ کے بعد مجھے کسی دوسرے سے پوچھنا نہ پڑے۔ فرمایا آمنتُ باللہ کہو اور اس پر ڈٹ جاؤ

غرض اسلام میں سماج (اجتماع) کے تمام شعبے خواہ وہ خارجی ہوں مثلًا سیاست، معشیت اور معاشرت جن کا عام نام "تمدن" ہے یا داخلی ہوں جیسے نظامِ تعلیم، دستورِ اخلاق، ادب و آرٹ جو تہذیب کے دائرہ میں آتے ہیں سب الہیاتی تصورات یعنی ایمان باللہ کے تابع ہیں۔

امارت پادشاہی علم اشیاء کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

ان تصریحات کے بعد ہم ایک ہی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ عہدِ حاضر کا کوئی سماجی نظریہ اسلام کے نظریۂ اجتماع سے مطابقت نہیں رکھتا اور اسلامی

فلسفۂ حیات کے تمام اجزاء مثلاً نظریۂ سیاست و معشیت، دستور اخلاق و معاشرت نظام تعلیم جماعتی آئین تنظیم ملی اور جہادِ حریت اپنی خصوصیات کے اعتبار سے بالکل جُداگانہ اور مستقل بالذات نوعیت رکھتے ہیں۔ اور یہ مکمل فلسفۂ حیات کسی دوسرے نظریۂ زندگی سے کسی سمجھوتہ کا روادار نہیں، نہ اپنے اندر کسی نظریہ کو جذب کرنا چاہتا ہے نہ خود اس میں جذب ہونا پسند کرتا ہے۔ اور نہ ہی اس کے زیر اثر رہنا گوارا کرتا ہے۔ بلکہ وہ ایک جامع اور مستقل بالذات نظام تمدن و تہذیب کا بانی ہے۔

عصرِ حاضر کے عناصرِ قومیّت

ان ضروری مباحث کے بعد اب وقت آگیا ہے۔ کہ ہم دورِ حاضر کے عناصر قومیت اور دواعیات اجتماع پر کتاب و سنت کی روشنی میں تبصرہ کریں اور ان سے پیدا ہونے والے اثرات و نتائج کا بھی تجزیہ کریں جن کی وجہ سے عالم انسانی کو ہولناک مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اور خصوصیت کے ساتھ یہ بھی بتایا جائے کہ ان جدید نظریہ ہائے اجتماع کے جاہلی تعدیئے نے کس طرح عالم اسلامی کی وحدتِ ملی اور مرکزیت کو پارہ پارہ کیا ہے؟ یہ ایک دلخراش داستانِ الم ہے جو دردناک ہونے کے علاوہ دلچسپ بھی ہے

حدیثِ دردِ دل آویز داستانے ہست
کہ ذوق بیش دہد چو دراز تر گردد

وطنیت

یوں تو اپنے آبائی وطن سے محبت و شیفتگی انسان کا ایک فطری اور طبعی اقتضاء ہے اور وطنیت کا جذبہ درحقیقت کوئی نئی چیز نہیں۔ بلکہ انسانی نفسیات کا ایک اہم پہلو ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ انسان کا ساتھ دیتا رہا ہے اور اس سے انکار کرنا درحقیقت عملی نفسیات (پریکٹیکل سائیکالوجی) کے بین حقائق سے انکار ہے مگر اس سے بھی زیادہ جو بات ناقابلِ انکار ہے

وہ یہ ہے کہ انیسویں صدی سے پہلے وطنیت کو یہ اصطلاحی حیثیت حاصل نہ تھی اور نہ ہی تاریخ کے کسی دور میں اس نے اتنی اہمیت حاصل کی ہے۔ جو اس وقت اسے حاصل ہے اور در اصل نفسِ جذبہ وطنیت اتنی بری چیز نہیں۔ مگر کوئی انسانی داعیۂ فطرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جائے۔ یہاں تک کہ دیگر مقتضیات انسانیت اس کی رَو میں بہہ نکلیں تو اس کا قدرتی نتیجہ عالمِ انسانی کے فساد و اختلال کی شکل میں رونما ہوتا ہے۔ کیونکہ نظامِ عالم کا بقا و قیام صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ تمام اجزاءِ حیات کو اپنی اپنی جگہ کام کرنے کا موقعہ ملتا رہے۔ اور ان میں فطری تناسب اور توازن قائم رہے، اور اگر حیات انسانی کا کوئی ایک جزو اُبھر کر اتنا اونچا چلا جائے کہ دیگر اجزاءِ حیات اس کے نیچے دب کے رہ جائیں تو پورے نظامِ زندگی میں تعطّل کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور عالمِ انسانی کو شدید قسم کے مہالک و خطرات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ موجودہ دور میں مشرق و مغرب کی اقوام احساسِ وطنیت کو اتنی اونچی سطح پر لے گئی ہیں۔ کہ زندگی کے تمام لوازم و مقتضیات سے توجہ ہٹا کر صرف اسی کو بناءِ قومیت مان لیا گیا ہے۔ گویا حیاتیات کا وسیع دائرہ صرف اسی نقطۂ مرکز کے گرد چکّر کاٹ رہا ہے۔ اور اسی بنا پر آج ہر جغرافی واحدہ (یونٹ) اپنے آپ کو اسی قسم کے دوسرے واحدوں سے اعلیٰ و برتر تصوّر کرتا ہے اور اپنی سیاسی و اقتصادی عظمت و برتری کے حصول میں کروڑہا انسانی لاشوں کو پاؤں تلے روندتا چلا جا رہا ہے۔ یہی وہ مکروہ جذبہ ہے جس نے

طاقتور اقوام کو کمزور اقوام پر مسلط کر رکھا ہے اور حریت و مساوات کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ ساتھ انسانوں کے مقدس خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
مقصود ہے تسخیر تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

(اقبالؒ)

حقیقت یہ ہے کہ وطنیت کی اس ہمہ گیر وباء کی ہلاکت خیزیوں نے کائنات انسانی کو جہنم بنا دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس خود غرضانہ جذبۂ وطنیت نے انسانیت کے عالمگیر رشتۂ اخوت کو تار تار کر دیا ہے اور عالم انسانی کو سینکڑوں ایسے متضاد و متخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جن کے مادی اغراض میں کبھی یکسانیت نہیں پیدا ہو سکتی اور آج ہر وطنی قومیت کے عزائم یہ ہیں کہ وہ تمام کرۂ ارضی کی سیاست و تجارت کو اپنے ہاتھ میں لے کر نوع انسانی کو ابدالآباد کے لئے محکوم بنانا چاہتی ہے۔ چنانچہ گذشتہ عالمگیر جنگ کی ہلاکت آفرینیاں اسی منحوس جذبہ کی پیدا کردہ ہیں اور جب تک اقوام عالم کے نظریۂ قومیت و اجتماع میں

بنیادی تبدیلی نہیں آئے گی۔ اس وقت تک یہ دنیا وحشت و بربریت کے خونچکاں مناظر دیکھتی رہے گی۔ اور امنِ عالم کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا

ان تنج منہا تنج من ذی عظیمتہ
الا فانی لاخالک ناجیا

عالمِ اسلامی اور تصورِ وطنیت

یہ کون نہیں جانتا کہ اسلامی قومیت کی بنیاد نظریۂ توحید و رسالت پر ہے اور اسلام کا پورا نظامِ اجتماع و سیاست اسی اصل پر مبنی ہے۔ مسلمان دنیا کے کسی کونے میں رہتا ہو۔ افریقہ کا وحشی ہو یا پیرس اور لندن کا مہذب شہری، کالا ہو یا گورا عربی ہو یا عجمی ہر حال میں وہ اس عالمگیر اسلامی قومیت (انٹرنیشنلزم) کا معزز رکن ہے اور دنیا کا کوئی رشتہ اسے اس قومیت سے جُدا نہیں کر سکتا۔ مگر عالمِ اسلامی کے لئے وہ منحوس ترین دور تھا جب کہ مغربی اقوام نے اپنی پیہم ریشہ دوانیوں سے ممالک اسلامی کے جسدِ ملی میں وطن پرستی کے زہرِ ہلاہل کے انجکشن شروع کر دیئے اور دنیائے اسلام کی ہمہ گیر اخوتِ اسلامی کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔ یہ ایسا خطرناک زہر تھا کہ اس کی تلخی نے آج تک ان کے کام و دہن کو مسموم کر رکھا ہے اور انہیں خون کے آنسو رلا رہی ہے۔ اور اب وہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ شاطرِ فرنگ نے مرکزیت اسلامی کو فنا کرنے کے لئے یہ سارا کھیل کھیلا تھا۔ اور اسی مقصد کے لئے وہ تہذیبِ نو کا چراغ ہاتھ میں

لے کر دنیا کے کونے کونے میں پھرا۔

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے
ہر ملّتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
یہ پیرِ کلیسا کی کرامت ہے کہ اس نے
بجلی کے چراغوں سے منوّر کئے افکار
جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ میرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجہ سے نکل کر
بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار
(اقبالؒ)

شاطرانِ یورپ نے عربی ممالک میں وطنیت کے جذبہ کو ابھار کر ان کو ٹرکی کے خلاف آمادہ بغاوت کیا اور انہیں یہ فریب دیا کہ ان کے لئے ایک خالص عرب نیشنل اسٹیٹ قائم کی جائے گی جس کے حدود میں فلسطین اور شام بھی شامل ہوں گے۔ چنانچہ شریف مکّہ سر میکموہن کے درمیان جو معاہدہ طے ہوا تھا اس میں عربوں کے لئے آزاد اسلامی جمہوریت کے قیام کا واضح الفاظ میں وعدہ کیا گیا نیز فلسطین اور شام کے کچھ حصّے بھی اس موعودہ عربی ریاست میں شامل کرنے کا لالچ دیا گیا۔ مگر جنگ کے خاتمہ پر ان مواعید کی جو مٹی پلید کی گئی اس نے عربوں کی آنکھیں کھول دیں۔ عربی ممالک کے حصّے بخرے کر لئے گئے فلسطین انگریز کے ہاتھ آیا۔

اور شام فرانس کے انتداب میں چلا گیا۔ اور سر میکموہن نے اس کے بعد لندن ٹائمس میں ایک بیان شائع کر دیا۔ جس میں یہ کہا گیا۔ کہ فلسطین جزیرۂ عرب میں داخل نہ تھا۔ مگر امیر عبداللہ والی شرق اردن نے اس دستاویز کی نقل وزیر مستعمرات اور میکموہن کے پاس بھیج دی جس میں موعودہ عرب جمہوریت میں فلسطین کو بھی داخل تسلیم کیا گیا تھا۔

مصر میں بھی اسی وطنیت کا بیج بویا گیا اور بالآخر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے کہ اہلِ مصر لگاتار جد و جہد کے باوجود آج تک انگریزی انتداب سے پیچھا نہیں چھڑا سکے۔ آج ایک بہت بڑے عرصہ کے بعد اسلامیانِ عالم کو ہوش آئی ہے۔ اور اب وہ پھر ایک دفعہ اتحادِ اسلامی (پان اسلامزم) کے لئے بے قرار نظر آ رہے ہیں اور "عرب لیگ" کی شکل میں انہوں نے عربی ممالک کا ایک بلاک بھی قائم کر دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اتحادِ اسلامی کی اس تحریک میں مصری سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔

یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

بہرحال انگریز کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانانِ عالم کی عالمگیر وحدتِ ملّی کو ختم کر دیا جائے۔ اور اس کی جگہ وطنی قومیت (نیشنلزم) کا زہر ان کے جسم میں داخل کر دیا جائے تاکہ عالم اسلامی مختلف وطنی وحدتوں (یونٹس) میں تقسیم ہو کر بین الاسلامی مرکزیت کو اپنے ہاتھوں دفن کر دے۔ اور اس مقصد میں اسے ایک بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔

انگریز نے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے استقلال ملّی کو ختم کرنے

میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی یہاں ان کے جداگانہ تشخص کو فنا کرنے اور ان کو متحدہ قومیت میں جذب کرنے کی ایک زبردست مہم چلائی اور اس کی پہلی کڑی یہ تھی کہ مسلمان کو سیاسی اور اقتصادی اعتبار سے مفلوج بنا دیا گیا اپنے حاکمانہ اقتدار کو ایسے ڈھنگ پر استعمال کیا کہ ہندو کو ابھار کر اونچی سطح پر لا کھڑا کیا اور مسلمان کے قومی و ملی جذبات کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ چنانچہ ایک انگریز (ہنٹر) نے اپنی قوم کے اس ظالمانہ کردار کو اپنے مخصوص منافقانہ انداز میں بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

"ہم اپنے دورِ حکومت کے پچھلے پچہتر سالوں میں انتظام ملک کی خاطر اسی طریقۂ تعلیم سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ گو اس دوران میں ہم نے اپنا طریقہ بھی رائج کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر جوں ہی ایک نسل اس نئے طریقے کے ماتحت پیدا ہو گئی ہم نے مسلمانوں کے پرانے طریقہ کو خیرباد کہہ دی جس سے مسلمانوں پر ہر قسم کی سرکاری زندگی کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگر مسلمان ذرا بھی عقلمند ہوتے تو اس تبدیلی کو بھانپ جاتے اور اپنی قسمت پر قناعت کرتے مگر ایک پرانی فاتح قوم اپنے شاندار ماضی کی روایات کو جلد فراموش نہیں کر سکتی"

(ہمارے ہندوستانی مسلمان)

یہ طریقۂ تعلیم کیا تھا؟ اس کے لئے لارڈ میکالے کے وہ تاریخی الفاظ کافی ہوں گے کہ

"ہندوستانیوں کو انگریزی تعلیم دلانا اس لئے ضروری ہے۔ کہ اس سے آہستہ آہستہ ہندوستانی ایک ایسی قوم میں تبدیل ہو جائیں گے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی اور کلچر کے اعتبار سے انگریز ہوگی۔"

انگریز کی یہ تعلیمی حکمت عملی اثر و نتیجہ کے اعتبار سے مسلمانوں کے مخصوص طرزِ اجتماع اور طریقِ تمدّن کے لئے سخت تباہ کن تھی اور ہندو کے لئے یہ سوال کچھ مشکل نہ تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی اپنا نظامِ تمدّن اور ضابطۂ اخلاق نہ تھا اور اس کی قومی روایات ہی یہ ہیں کہ وہ ہر طاقتور کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اور ہر نئے رنگ کو قبول کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ نیز انگریز بھی جانتا تھا کہ ایک بنیا قوم کے لئے سب سے زیادہ دلکش چیز یہی ہو سکتی ہے کہ اس کو معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں اور اس طرح ہندو قوم کا مکمل تعاون حاصل کیا جائے۔ مگر مسلمانوں کی حالت اس سے بالکل جداگانہ تھی، ان کے پاس ایک مکمل ضابطہ اخلاق اور نظامِ تہذیب و تمدّن تھا۔ اس لئے ان کے لئے یہ امر سب سے زیادہ دشوار تھا۔ کہ وہ اپنے قومی تشخص کو فنا کر کے کسی ایسی قومیت میں جذب ہو جائیں۔ نیز زوالِ حکومت کے بعد مسلمانوں کو جن شدائد و مصائب سے دوچار ہونا پڑا اس کا لازمی نتیجہ ان کے فکر و ذہن میں انتشار کی شکل میں ظاہر ہوا اور اس بنا پر وہ اپنے لئے کوئی صحیح لائحہ عمل بھی متعین نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ خوفناک منظر ان کی آنکھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ غرض مسلمانوں کی جداگانہ

اور مستقل قومیت پر یہ پہلا وار تھا۔

نیز انڈین نیشنل کانگریس کا قیام بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے پہلے پہل انگریزوں نے ہی یہ جماعت قائم کی تھی اور درحقیقت مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کو مٹا کر ایک متحدہ ہندوستانی قوم کی تعمیر کے لئے یہ دوسرا قدم تھا۔ چنانچہ کانگریس آج تک اسی راستہ پر گامزن ہے اور مسلمان بھی ایک عرصہ تک اس گمراہی میں مبتلا رہا۔ مگر آج استقلال ملی کے احساس نے اسے کانگریس کے مدِمقابل کھڑا کر دیا ہے۔

غرض انگریز نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے مسلمانوں کے استقلال قومی کے مقابلہ میں زبردست مہم شروع کر دی۔ اور اس میں اُسے ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ چنانچہ کمپنی بہادر کے عہد میں سب سے پہلے بہار کے ایک طباطبائی سید نے ہندوستان کی جو تاریخ لکھی اس میں اکبر کی "ہندی قومیت" کی ان الفاظ میں تعریف کی گئی ہے۔

مذہب الٰہی کہ آسائش غیر متناہی خلق دراں بود تا عہدِ جہانگیری رواج داشت باز از عہد شاہجہان تعصب شروع شد در عہد عالمگیر شدت پذیرفت

(سیر المتاخرین ص۱۴۴ ج ۱)

یعنی دین الٰہی جس میں مخلوق کے لئے بے شمار آسائشیں تھیں۔ صرف عہد جہانگیری تک رواج پا سکا اور شاہ جہاں کے عہد سے پھر تعصب شروع ہو گیا اور پھر عالمگیر کے عہد میں اس نے اور بھی شدت اختیار کر لی۔

بہار کا علاقہ بنگال کی طرح کمپنی بہادر کے زیر نگیں تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریز نے آتے ہی اپنی سیاست کی بنیاد متحدہ قومیت اور لا مذہبیت پر رکھی تھی۔

اس موقعہ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متحدہ قومیت کی اس پہلی کوشش کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے جو انگریز کی آمد سے کافی عرصہ پہلے عمل میں لائی گئی تھی۔

قومیّت متحدہ کی پہلی کوشش

اس سے پہلے کسی باب میں ہم ذکر کر آئے ہیں کہ مسلمانانِ عالم کے اجتماعی تصوّرات میں اگرچہ بنی اُمیہ کے دور سے ہی تبدیلی شروع ہو گئی تھی۔ مگر کم از کم یہ امر عالم اسلامی میں اب تک مسلم چلا آتا ہے۔ کہ اسلامی قومیّت کی اساس اسلام کے مخصوص نظریات پر ہے۔ مگر اکبر کے عہد میں یہ کسر بھی پوری ہو گئی اور اس نے ایک جدید ہندی قومیّت کی بنیاد رکھی جس میں ہندو ازم کو سب سے زیادہ نمایاں جگہ دی گئی۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہندو، اکبر کو "اکبر دی گریٹ" کے معزز خطاب سے یاد کرتا ہے اور اس کے نئے دین کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہے اور ایک رسوائے عالم کانگریسی مسلمان نے یہاں تک کہہ دیا کہ "یہ ان لوگوں (اکبر وغیرہ) کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں"

اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دنیا کے کسی حصہ میں جب بھی کوئی

نیا فتنہ اٹھا تو سب سے پہلے علماء سوء نے اس کا ساتھ دیا۔ اور امراء و سلاطین نے اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ہمیشہ اسی گروہ کو آلۂ کار بنایا چنانچہ اس دور میں یہی چیز سامنے آتی ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی اپنی کتاب "منتخب التواریخ" میں رقمطراز ہیں :۔

درایں سال اسافل واراذل عالم نمائے جاہل نعاصند دلائل باطل نمودہ برین آوردند کہ حالا صاحب زمانے کہ رافع خلاف داختلاف ہفتاد و دو ملت از مسلم و ہندو باشد حضرت اند	اس سال کچھ کمینہ اور رذیل عالم نما جاہلوں نے دلائل باطلہ سے یہ بات ثابت کی ہے کہ وہ "صاحب زمان" جو ہندو اور مسلمانوں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو دور کرنے والا ہوگا وہ حضرت شاہ اکبر ہی ہیں

منتخب التواریخ صہ ۲۷۹

حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں :۔

عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلمات بدعت آرام گرفتہ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند و بہ احیاء سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہندہ ہائے بدعت اند	عالم بدعت کے دریا میں غرق ہو چکا ہے اور بدعت کی تاریکیوں میں آرام کر رہا ہے کسی کی طاقت نہیں کہ بدعت کے خلاف آواز اٹھائے اور احیاء سنت کے لئے زبان کھولے اس وقت کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے ہیں۔

مکتوبات صہ ۵۴ دفتر دوم حصہ ہفتم

اس ہندی قومیت کے علمبرداروں نے احکام اسلامی اور شریعت حقّہ کی علانیہ توہین شروع کر دی شراب حلال کر دی گئی ۔سود اور جوئے کی عام اجازت دے دی گئی۔ خنزیر اور کتّے کی حرمت کو منسوخ کر دیا گیا اور ختنہ کی رسم اڑا دی گئی ۔ غرض شریعت مصطفوی کو رسوا کرنے میں انہوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی ۔عربی زبان کا سیکھنا اور علوم عربی کی تحصیل عیب شمار ہوتی تھی ۔

عربی خواندن و دانستن آں عیب شد و فقہ و تفسیر و حدیث و خوانندہ آں مطعون و مردود شد (منتخب التواریخ)	عربی پڑھنا اور جاننا عیب خیال کیا جاتا ہے ۔ فقہ، تفسیر، حدیث اور ان علوم کا جاننے والا مطعون اور مردود ہو گیا ہے ۔

ملّا صاحب ایک مقام پر لکھتے ہیں :۔

بدبختے چند از ہندواں و مسلمانان ہندو مزاج قدح صریح بر نبوت می کردند	چند ہندو اور ہندو مزاج مسلمانوں نے نبوت پر سخت حملہ کیا ہے ۔

ہندی قومیت کے علمبردار اکبر نے یہ احکام صادر کر دیئے تھے کہ ہندوؤں کی کتابوں کو ہندی سے فارسی میں ترجمہ کر کے مسلمانوں میں ان کو رواج دیا جائے

چنانچہ ملّا عبدالقادر صاحب لکھتے ہیں :۔

اکنوں کتابہائے ہندی راکہ انایانِ	اب ہندی کی کتابوں کو جو ہندوؤں

مرتاض عابد نوشتہ اند وہمہ صحیح ونص قاطع است ومدار دین واعتقادات وعبادات این طائفہ (ہندو) برآنست ترجمہ از ہندی بزبان فارسی فرمودہ چرا بنام خود نہ سازم کہ غیر مکرر و تازہ است وہمہ مثمر سعادت دینی و دنیوی	کے زہد پیشہ علماء و عقلائے نے لکھی ہیں اور سب صحیح اور نص قاطع ہیں۔ ہندو کے اعتقادات، عبادات اور دین کا ان پر ہی دارو مدار ہے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کر کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کر دیا جو غیر مکرر اور تازہ مضمون پر مشتمل ہیں اور سب دنیوی و دینی سعادت پر منتج ہیں

منتہ ۳۴

اکبر کے بعد عہد جہانگیری کا بھی یہی حال رہا۔ چنانچہ حضرت مجدد رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

غربت اسلام نزدیک بہ یک قرن بہ نہجے قرار یافتہ است کہ اہل کفر بہ مجرد اجرائے احکام کفر بر ملا در بلاد اسلامی راضی نمی شوند۔ می خواہند کہ احکام اسلامی بالکلیہ زائل گردند واثرے از مسلمانان ومسلمانی پیدا نہ شود کار بآں سرحد رسانیدہ اندکہ اگر مسلمانے از شعائر اسلام اظہار	ایک زمانہ سے اسلام کی غربت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اہل کفر علانیہ احکام کفر کے اجراء و نفاذ پر مطمئن نہیں ہیں بلکہ چاہتے ہیں کہ احکام اسلامی بالکلیہ فنا ہو جائیں۔ مسلمانوں اور مسلمانی کا کوئی اثر باقی نہ رہے یہاں تک کہ اگر کوئی مسلمان اسلامی شعائر کا اظہار کرتا ہے تو اسے قتل

نابد بہ قتل می رسد۔
(مکتوبات ۱۶۳)

کر دیا جاتا ہے۔

یہ تھی ملت اسلامیہ کے استقلال کو ختم کرنے کی پہلی کوشش جس نے مسلمانانِ ہند کے عقاید و اعمال میں تزلزل پیدا کر دیا تھا اور مجدد و ملت حضرت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملحدانہ تصور قومیت کو اپنی روحانی قوت سے شکست دے کر ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا۔ یہ سچ ہے کہ اگر خدائے بزرگ و برتر اس وقت حضرت مجدد سے اپنے دین کی خدمت نہ لیتا تو آج ہندوستان میں شاید ایک مسلمان بھی نظر نہ آتا۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار

قومیت کے دیگر عناصر

رنگ و نسل، مخصوص طرزِ تمدن، ثقافت اور معاشی محرکات بھی قومیت کے عناصر شمار ہوتے ہیں۔ جہاں تک رنگ و نسل کا تعلق ہے بے شک یہ ایک قدرتی رشتہ ہے جو چند افراد انسانی میں باہم محبت و ہمدردی کے جذبات پیدا کرتا ہے اور ان افراد کے رہن سہن اور باہمی تعلقات سے ایک مخصوص طرزِ معاشرت، زبان، ثقافت اور تہذیب کی تخلیق ہوتی ہے مگر

ان امور کا پس منظر صرف مادی تقاضے ہیں جو ان کو اپنے مادی وجود کے بقاء و تحفظ پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر انسانیت کے اس اہم ترین شعبہ کو (جو اخلاقی اقدار اور روحانیات سے موسوم ہے، اور حقیقی سعادت و فلاح انسانی کا ضامن ہے) ان امور میں کوئی دخل نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ نظام تمدن صداقت دیانت اور تمام ایسی صفات سے یکسر عاری ہے۔

نیز متذکرہ بالا داعیات قومیت، انسانیت کے اس ابتدائی دور کی غمازی کرتے ہیں۔ جبکہ عالم اسلامی سن طفولیت سے گزر رہا تھا۔ اور اس کے نظریہ اجتماع نے ایک کنبہ کی چار دیواری سے آگے نکل کر قبیلہ و خاندان کی محدود وسعت میں قدم رکھا۔ مگر عالم انسانی کا منتہائے مقصود وہ عالمگیر رشتہ اخوت ہے۔ جو ان عارضی قیود سے بالکل آزاد اور ہمہ گیر صداقت کا تابع ہے۔

نیز قومیت کے یہ عناصر محض عارضی اور ناپائیدار ہیں، جب ایک شخص اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں مستقل رہایش اختیار کر لیتا ہے تو دفعتہً یا تدریجاً اس کے معاشی تقاضے، طرز معاشرت، ثقافت اور زبان وغیرہ سب بدل جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسلام کسی ایسے رشتہ کو قومیت کی اساس نہیں قرار دیتا جو احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ بدل جاتا ہے۔ بلکہ اسلام میں قومیت کی اساس وہ عقائد راسخہ ہیں جو زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہیں اور کوئی خارجی اثر ان میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا

اسلام کا نظریۂ قومیّت

انسانیت کبری کے ارتقاء کی آخری منزل فکر و عمل کا وہ بلند ترین مقام ہے جو اسلامی نظریۂ حیات کے توسط سے حاصل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ آخری اور مکمل فلسفۂ زندگی ہے۔ جو انسان کے غیر فطری اور تباہ کن داعیات قومیت کے علی الرغم ایک عالمگیر اخوتِ انسانی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اور کائناتِ انسانی کو ایسی پرامن دنیا میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ جہاں جنگ و قتال کے یہ خونیں مناظر ہوں نہ شیطانی آلاتِ حرب کی تباہ کاریاں! ظالم کے طاقتور بازوؤں میں اتنی ہمت ہی نہ ہو۔ کہ وہ انسانی آبادیوں کو تہ و بالا کر کے اس کے وسائل معشیت پر غاصبانہ تسلط قائم کر سکے۔ مظلوم انسان کی دردناک آہیں دنیا کے کسی گمنام گوشہ سے بھی سنی نہ جا سکیں اور چیخ و پکار کی یہ دل خراش صدائیں جو آج دنیا کے گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہیں کیف انگیز نغموں میں تبدیل ہو جائیں اور یہ دنیا جنت کا نمونہ بن جائے تلك الجنة التی اور ثتموها بما كنتم تعملون کی صداؤں سے فضائے آسمانی گونج اٹھے

یہ مبارک ساعت کب آئے گی ؟ اس وقت جبکہ عقل انسانی ہر طرف سے عاجز آکر اپنی شکست کا اعتراف کر لے گی اور بالآخر اسے انبیاء و رسل کے لائے نظریۂ حیات کے سامنے جھکنا پڑے گا۔ انسانی فکر و ذہن

میں حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو جائے گی۔ اور اقتدارِ حکومت ان جفا پیشہ اقوام کے ہاتھوں سے نکل کر خدا پرست اور صالح انسانوں کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے گا۔

الذین ان مکنّاھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر	وہ لوگ جن کو ہم اگر غلبہ اور تمکنت فی ارض عطا کریں گے تو وہ نماز کو قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ بھی انجام دیں گے

یہ حقیقت ہے کہ موجودہ تصادم اقوام کے نتائج ایک دفعہ پھر عالم انسانی کو فکر و عمل کے اُس مرکز کی طرف دعوت دے رہے ہیں جس سے اس کی ارتقائی حرکت کی ابتداء ہوئی تھی اور قیام قیامت سے پہلے یہ حرکت زمانی اور آخری منزل تک پہنچ کے رہے گی جس کی ایک جھلک آج سے تیرہ سو سال پہلے زمانۂ رسالت اور عہدِ خلافت راشدہ میں دیکھی جا چکی ہے

ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السمٰوٰت والارض	زمانہ ایک لمبا چکّر کاٹ کر اسی مرکز طبعی پر آ پہنچا ہے۔ جس سے اس کا آغاز ہوا تھا

(بخاری)

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم (اقبالؒ)

اصطلاحی قومیّت

قوم دراصل عربی لفظ ہے جس کا مادّہ ایسی کثرت پر دلالت کرتا ہے جس میں وحدت واجتماع کی حالت موجود ہو، قوام تقویم اور اس قسم کے دوسرے الفاظ جو اس مادہ پر مشتمل ہیں سب میں من وجہ یہ مفہوم پایا جاتا ہے۔ عربی زبان میں فرقہ اور افراد کے نہایت مختصر مجموعہ پر بھی قوم کا اطلاق ہوتا ہے۔ مگر اسی وقت جبکہ ان میں کوئی وجہِ جامعیّت موجود ہو

قوم لهم فكرةٌ تجولُ بهم
بين المعاني اولئك النُّجب

وحدتِ نسل پر قوم کا اطلاق تمام زبانوں میں پایا جاتا ہے۔ اور متعارف بین الناس ہے۔ قرآنِ کریم میں جہاں انبیاء علیہم السلام کافر اقوام کو "یا قوم" سے خطاب کرتے ہیں وہاں اتحادِ نسل کے سوا کوئی وجہِ جامعیّت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومِ موسٰی اور قوم فرعون ہر جگہ دو الگ الگ قومیں ذکر ہوئی ہیں حالانکہ اتحادِ مکانی کی بناء پر ایک قوم کا اطلاق ہونا چاہیئے تھا۔ اسی طرح یہودِ مدینہ اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ اتحادِ مکانی یہاں بھی موجود ہے۔ یا ایها الذين آمنوا لا تتولوا قوماً غضب الله عليهم

اس مختصر مقالہ میں لغوی معانی سے نکل کر مخصوص اصطلاحی معانی میں استعمال ہونے لگتے ہیں تو عرفِ عام میں دوسرے معنے ہی مراد لئے جاتے ہیں یہاں

تک کہ ان الفاظ کے استعمال میں بسا اوقات معانی لغویہ کی طرف ذہن کا انتقال ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ کثرت استعمال کی وجہ سے اصطلاحی معنے ہی متبادر الذہن ہوتے ہیں غایت ما فی الباب یہ کہ لغوی اور اصطلاحی معنوں میں من وجہ مناسبت ضرور ہوتی ہے۔ جدید عربی الفاظ میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

"رجعت" ایک جدید عربی اصطلاح ہے۔ اس کے قدیم معنے لوٹنے کے ہیں مگر جدید عربی اصطلاح میں معاکسۂ عمل (ری ایکشن) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"رسمی" جدید اصطلاح میں "آفیشل" کا مفہوم ادا کرتا ہے "عدمی" قدیم عربی میں "وجودی" کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ اور موجودہ اصطلاح میں مخالف حکومت (انارکسٹ) کو کہتے ہیں۔ اسی طرح عہدِ حاضر کی سینکڑوں اصطلاحات ہیں جن میں قدیم معنے متروک ہو چکے ہیں۔ عدم تشدد، ترک موالات، اشتراکیت اور اشتمالیت اسی قسم کی سیاسی اصطلاحیں ہیں

اسی طرح "قومیت" (نیشلزم) بھی زمانہ حال کی سیاسی اصطلاح ہے۔ جو فرقہ پرستی (کمیونزم) کے مقابلہ میں استعمال ہوتی ہے۔ بولنے والے اور سننے والے اس سے یہی جدید معنے مراد لیتے ہیں اب اگر کوئی صاحب اس کے لغوی معنوں کو سامنے رکھ کر لوگوں کو دھوکا دینا چاہے تو یہ نہایت شرمناک لسانی غلطی ہوگی اور خلط مبحث کا بدترین اسلوب!

موجودہ اربابِ سیاست کے بیانات کی روشنی میں متحدہ قومیت

کی تعریف یہ ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی جملہ اقوام کو ایک ایسی قوم میں تبدیل کرنا جس کا مذہب نام، تمدّن وثقافت، تہذیب ومعاشرت اور سیاسی نقطۂ نظر ایک ہو۔ اس لحاظ سے متحدہ قومیت کی تشکیل مندرجہ ذیل عناصر ترکیبی پر مشتمل ہوگی :-

(۱) اسلام اور ہندوازم کی خصوصیات کو مٹا کر ایک مشترکہ مذہب کی تعمیر۔

(۲) جداگانہ طریق تمدّن، طرزِ معاشرت اور دیگر خصوصیاتِ ملّی کو مٹا کر ایک متحدہ تمدّن کو بروئے کار لانا۔

(۳) اس جدید قوم کے سیاسی اور اقتصادی نقطہ ہائے نظر اور اغراض ومقاصد میں وحدت ویگانگت پیدا کرنا۔

(۴) اقوام ہند کے ان جداگانہ ناموں کو جن سے وہ آج تک جانی اور پہچانی جاتی ہیں بالکل ختم کر دینا اور ان کی جگہ کوئی ایک نام تجویز کرنا۔

کانگریسی مدبّرین کے نزدیک یہ جداگانہ مذاہب قومیّت متحدہ کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں، متحدہ قومیّت کی تشکیل وتعمیر اسی وقت عمل میں آئے گی جبکہ ان تمام مذاہب کو مٹا دیا جائے گا۔ مگر چونکہ یہ کام کچھ آسان نہیں اس لئے قومیّت کی معراج تک پہنچنے سے قبل درمیانی عرصہ میں مذہب کو کم از کم ایک نجی اور پرائیویٹ حیثیّت دے دی جائیگی جس کو ملکی سیاسیات سے کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا۔

اسلامی قومیت

یہ بھی عجیب بات ہے کہ آج ان مسلمات کے لیے بھی دلائل و براہین کی ضرورت پڑ رہی ہے جو ساڑھے تیرہ سو سال سے ملّت اسلامیہ میں مسلّم چلے آتے ہیں۔ اور تاریخ اسلامی کے کسی دور میں ان کے متعلق کوئی اختلاف و نزاع پیدا نہیں ہوا۔ کتاب و سنت کی تصریحات اس باب میں اس کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہیں کہ توحید و رسالت کو چھوڑ کر شاید ہی کسی دوسرے اسلامی مسئلہ کے متعلق ہوں۔ مسلمانوں کی جداگانہ اور مستقل مرکزیت، تنظیم ملّی، جہاد حریت اور مخصوص اسلامی تمدّن وہ مہتم بالشّان اسلامی مسائل ہیں جو اساسِ دین اور مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے غیر متزلزل ارکان ہیں، مگر زمانہ کی بوالعجبیوں کا بھی کچھ ٹھکانہ ہے، کہ آج حاملین شریعتِ حقّہ نے ہی ان اجماعی مسائل میں اختلاف پیدا کر دیا ہے۔

"قومیت اور وطنیت کے نظریئے سراسر غیر اسلامی ہیں اور اس پر قرآن و حدیث سے ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ کہ اسلام کی نظر میں انسانوں کی تقسیم صرف ایمان و عمل سے ہوتی ہے۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر بعثتِ سیدنا آدم اور نزولِ قرآن تک تمام انبیاء و رسل کی الہامی تعلیمات میں یہی نظریۂ تقسیم تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ اور اس سے انکار کرنا ایسا ہی ہے کہ عین نصف النہار کے وقت جبکہ سورج اپنی نورانی شعاعوں سے کائنات کے تاریک سے تاریک حصّہ ارضی کو بھی منوّر کر رہا ہو

کوئی عقل کا اندھا اٹھ کر سورج کے وجود ہی سے انکار کر دے۔ قرآن حکیم کی ابتدائی سطور سے آخیر تک خواہ انبیاء سابقین کے تذکرے ہوں یا امم سابقہ کے واقعات، فکری اور نظری مسائل ہوں یا معاشی اور سیاسی قواعد و ضوابط سب میں آپ کو یہی حقیقت ابھری ہوئی نظر آئے گی۔ کہ انسانوں کی قومیت کی اساس صرف فکری انحاد پر ہے

چنانچہ قرآن حکیم نے کہیں "الذین آمنو" اور "الذین کفروا" کے اعتقادی تقابل سے اس حقیقت کبریٰ کو بے نقاب کیا ہے۔ اور کہیں "اصحاب الجنتہ" اور "اصحاب النار" کے مکافاتی تصور سے انسانوں کے دو گروہوں میں حقیقی اور ابدی مغائرت کا اظہار کیا ہے۔ کہیں ان دو گروہوں کو "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے اور کہیں "خیر البریہ" اور "شر البریہ" کے نتائج فکر و عمل کو جدا جدا کر کے دکھایا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جن افراد انسانی میں اس قسم کا ابدی اور حقیقی تضاد ہو ان پر ایک قوم کا اطلاق کسی طرح جائز نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ "حزب اللہ" اور "حزب الشیطان" کو ان کے الگ الگ مسلک، طریق کار اور جداگانہ شعائر ملی کو کالعدم قرار دے کر ایک ہی قومیت میں جذب کر دیا جائے۔ کیا اس غیر فطری ترکیب سے جو مجموعہ تیار ہوگا وہ قرآن کی نظر میں حزب الشیطان نہیں ہوگا؟ حزب اللہ اور حزب شیطان کی

حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروؤں کے لئے فکر و عمل کا ایک،

معین ضابطہ پیش کر دیا ہے۔ اور ان کی جد و جہد کے لئے ایک مخصوص شاہراہِ عمل بھی متعین کر دی ہے مسلمانوں کی تنظیم ملی، جہادِ حریت اور نظام مرکزیت بالکل الگ نوعیت رکھتے ہیں اور مسلمانوں کو اس امر کی قطعاً اجازت نہیں کہ وہ اپنی رائے اور صوابدید سے اس معین اور مستحق معیار فکر و عمل سے سر مو بھی تجاوز کریں اگر ایسا کرنا ممکن ہوتا تو ختم المرسلین صلعم نے اس وقت کیا ہوتا جب کہ ارضِ مکہ کی ساری وسعتیں فرزندانِ توحید کی اس مختصر سی جماعت کے لئے تنگ آ چکی تھیں۔ اور قدم قدم پہ مصائب و آلام کے پہاڑ سامنے کھڑے تھے۔

ابوجہل، اسود ابن لغوث اور چند دیگر آئمہ کفر آنحضرت صلعم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا اے محمدؐ تم یہ چیخ و پکار کس لئے کر رہے ہو اگر آپ کو دولت و زر کی ضرورت ہے تو خدا کی قسم ہم آپ کے گھر میں سونے اور چاندی کے انبار لگا دیں گے۔ اگر کسی پری پیکر حسینہ سے شادی کرنا چاہتے ہو تو تم ایک دفعہ اشارہ کرو ہم ارضِ مکہ کی سب سے بڑی حسینہ آپ کے قدموں میں حاضر کر دیں گے۔ اور اگر آپ کو حکومت و سرداری کی ضرورت ہے۔ تو تمام قریش آپ کو اپنا حاکم و سردار تسلیم کر لیں گے مگر سردار دو جہاں صلعم نے جواب دیا۔ مجھے ان چیزوں میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں مجھے تو صرف آپ کی بہتری اور نجات مطلوب ہے۔ اس پر کفار نے کہا اچھا اگر اور نہیں تو اتنا ضرور کریں کہ ہمارے بتوں کو علانیہ برا بھلا نہ کہا کریں اور بت پرستی کی مذمت نہ کیا کریں۔ ہم آپ سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ آپ شوق

سے نمازیں پڑھیں، روزے رکھیں، تلاوت کریں اور اپنے پیروؤں کو وعظ و نصیحت کرتے رہیں۔ اس پر خدائے قدوس کی طرف سے یہ قرآنی آیتیں نازل ہوئیں :-

ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ و ھو اعلم بالمھتدین فلا تطع المکذبین، ودوا لو تدھن فیدھنون
(سورۂ القلم ۲۹)

بے شک آپ کا رب گمراہوں اور ہدایت یافتہ لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ آپ ان کفار کی کوئی بات تسلیم نہ کریں۔ یہ چاہتے ہیں کہ کچھ آپ ان کے آگے جھک جائیں اور پھر وہ بھی کچھ جھکنے لگیں

اب آپ ابوجہل کے مطالبہ کی آخری شق پر غور کریں۔ کہ کیا یہ متحدہ قومیت کی دعوت ہی تو نہیں تھی؟ کفار مکہ اس بات کو پسند کرتے تھے کہ آنحضرت صلعم اپنے مقاصد دینی اور اعلاء کلمتہ الحق میں کچھ تھوڑی سی ملائمت اور کسی قدر مصالحانہ طرزِ عمل اختیار کریں۔ تو وہ (قریش) آپ کو متحدہ قومیت کا صدر اعظم (پریذیڈنٹ) تسلیم کرلیں، کفار یہ بھی وعدہ کرتے تھے کہ ہم تمہاری نماز، روزہ، تعمیر مساجد اور دیگر مذہبی رسومات کی ادائیگی میں حارج نہ ہوں گے اور تمہارا مذہب، کلچر اور مذہبی رسوم آزاد ہوں گی۔ مگر وہ کون سی بات تھی جس کی بناء پر رب قدوس نے آنحضرت صلعم کو سختی سے حکم دیا کہ آپ اپنے نصب العین میں کسی قسم کی مداہنت نہ کریں۔ وہ بات صرف یہ تھی کہ آنحضرت صلعم کے اتنا تسلیم کر لینے میں اسلام کے معین اور مخصوص طریق فکر و عمل کی موت تھی اگر بالفرض ایسا ہوتا تو مسلمان کا قدم وہیں رک

کررہ جاتا اور جس عظیم الشان مقصد کے لئے سردار دو جہاں صلعم کی بعثت ہوئی تھی اس کی ہرگز تکمیل نہ ہوسکتی۔

اگر غور کیا جائے تو ابوجہل کی دعوتِ قومیت خداوندانِ کانگریس کی متحدہ قومیت سے بہت نرم تھی۔ یہاں تو جداگانہ مذاہب، اور اقوامِ ہند کے الگ الگ طرزِ تمدّن کسی صورت میں برداشت نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایسی ہندوستانی قومیت کی تعمیر کی جائے گی، جس کے مذہب، آئین سیاست طریقِ تمدّن اور طرزِ معاشرت میں من کل الوجوہ یکسانیت ہوگی۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما

آئندہ صفحات میں ہم نصوص کتاب وسنت اور مستند تاریخی حقایق کی روشنی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ اجتماع ایک مستقل بالذات حیثیت رکھتا ہے اور اپنی ہمہ گیر اور محیط کل افادیت کے اعتبار سے تمام انسانوں میں امن ومساوات پیدا کرسکتا ہے:-

---

اسلام کا نظامِ اجتماع

کسی نظریئہ کے ردو قبول سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے۔ کہ انسان کی حیات اجتماعیہ پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے اور اسے قبول کرنے کے بعد حیات انسانی میں کیا انقلاب رونما ہو سکتا ہے؟ اس حیثیت سے اسلام کے فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) اور سماجی نظام پر اگر متانت کے ساتھ غور کیا جائے تو یقیناً اعتراف کرنا پڑے گا کہ یہی ایک ہمہ گیر اور مکمل نظریۂ حیات ہے۔ جو خاندانی قبیلوی۔ جغرافی اور نسلی حد بندیوں سے بلند تر اور تمام دنیائے انسانیت کو اپنے آغوشِ امن میں پناہ دے سکتا ہے اور اسلام کی دعوت کسی مخصوص گروہِ انسانی یا کسی معین مرز و بوم تک محدود نہیں بلکہ انسانیتِ مطلق کے لئے ہے جس کا مقصد دنیا کے سارے انسانوں کو ایک عالمگیر رشتۂ اخوت میں منسلک کرنا ہے۔ اس عالمگیر برادری کا ہر رکن تمام حقوقِ انسانی سے بہرہ ور ہوتا ہے ایک ادنیٰ سے ادنیٰ شہری کو وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں جو اس کے امیر المومنین کو حاصل ہیں۔

دنیا کی کسی قوم کے پاس ایسا کوئی سماجی نظام نہیں جس میں دنیا کے پس ماندہ طبقوں کے لئے بھی امن و راحت کا پیغام ہو، اور امیر و غریب، شاہ و گدا، اسود و احمر اور حاکم و محکوم کے لئے ایک ہی قسم کے مجلسی آداب، ایک

ی دستورِ اخلاق، ایک ہی طرح کی آزادی فکر اور ایک ہی رنگ کے ملکی انتظامی اور تعزیری قوانین ہوں۔ اگر یہ صحیح ہے تو پھر انسانوں کی بدبختی پر ماتم کرنا چاہیئے کہ انہوں نے اسلام کے اس پیامِ امن و مساوات کی کوئی قدر نہیں کی اور صدیوں تک انسانوں کے بنائے ہوئے جابرانہ قوانین اور سوسائٹی کے رسم و رواج کے سلاسل و اغلال میں جکڑے رہنے کے باوجود امن و سلامتی کی اس شاہراہ پر نہیں آ سکے۔

انسانیت کے ابتدائی دَور میں انسان کی تگ و دو صرف اپنے گھر کی چار دیواری تک ہی محدود تھی، کسی نہ کسی طرح پیٹ بھر لینا ہی اس کی نوعی اور تمدّنی ضروریات کا منتہائے نظر تھا مگر آہستہ آہستہ اس انفرادیت کا دور گزر گیا انسانی تعلقات میں وسعت پیدا ہونے لگی اور ایک خاندان یا قبیلہ کی ایک چھوٹی سی وحدت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد انسان اور بھی ارتقائی منازل طے کرتا گیا یہاں تک کہ خاندانی اور قبیلوی وحدت سے نکل کر اس نے مرز و بوم اور وطن کے تصوّر پر قومیّت کی بنیاد رکھی، غرض ہر زمانہ کے مخصوص ماحول اور وسعتِ علائق کے ساتھ ساتھ اجتماع و تمدّن کے دوائر بھی بدلتے رہے مگر جغرافی اور رنگ و نسل کی وحدات پر یہ سلسلہ رک گیا اور عالمگیر وحدتِ انسانی تک ان کی رسائی نہ ہو سکی اور پھر انسانیت کا کوئی دور طبقاتی تقسیم سے خالی نہیں رہا، امیر و غریب، شریف و ذلیل، مزدور و سرمایہ دار اور حاکم و محکوم کی ظالمانہ تفریق ہر زمانہ میں برابر اپنا کام کرتی رہی ہے۔

موجودہ اقوام عالم جو حریّت و مساوات اور جمہوریت کی علمبردار ہیں ۔ آج بھی اس قدیم جاہلی تنگ نظری میں مبتلا ہیں ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ ایک جدید نظام تمدّن کی موجد ہیں جس میں ہر انسان شہری حقوق سے بہرہ ور ہے ۔ مگر یہ کہنے کی باتیں ہیں ان کا ہر عمل خود ہی اس کی تردید کر رہا ہے آج بھی غریب و نادار طبقوں کی وہی حالت ہے ۔ جو تہذیب و تمدّن کے موجودہ دور سے قبل تھی، آج بھی مظلوم انسانیت جبر و قہر کے ہاتھوں پامال ہو رہی ہے اور ان کی نظر میں شرافت و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت نہیں ۔ پرستارانِ تہذیب حاضر بلکہ ان کے وطنی اور نسلی تعصب نے عالم انسانی کو عذاب الیم میں مبتلا کر رکھا ہے ؎

یہ علم یہ حکمت یہ تدبّر یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

(اقبالؒ)

اور آج کائنات انسانی جنگ و قتال کے شعلوں کی لپیٹ میں کھڑی ہے ۔

ظهر الفساد فی البر و البحر بما کسبت ایدی الناس (الآیۃ)

مگر دُنیا کے انسان اس حقیقت سے جس قدر جلد آگاہ ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہو گا کہ اسلام ان کے خود ساختہ طبقاتی تصوّر اجتماع کے علی الرغم تمام عالم انسانی میں حقیقی مساوات پیدا کرتا ہے ۔ اور یہی وہ جہانی نظریۂ حیات ہے ۔ جس میں

انسانیت عامہ کے لئے امن وراحت کا سامان موجود ہے۔

کتاب وسنت یعنی قرآن اور بانی اسلام صلعم کی مقدس سیرت میں اسلامی فلسفۂ اجتماع کے اصلی خط وخال دیکھے جاسکتے ہیں۔ قرآن حکیم اور بانی اسلام صلعم نے جس خدا کا تصور پیش کیا ہے وہ "رب العلمین" یعنی سارے عالم کا رب ہے نہ کہ کسی خاص فرقہ یا خطۂ ارضی کا محمدؐ عربی صلعم کو تمام نوع انسانی کے لئے نبی رحمت اور بشیر ونذیر ہونے کا عظیم الشان منصب عطا ہوا ہے

وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیرًا ونذیرا	ہم نے آپ کو اے نبی تمام انسانوں کے لئے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے

اسی طرح قرآن حکیم کی دعوت کسی خاص نسل، قوم اور وطن کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے ہے اور دنیا کا ہر انسان اس کا مخاطب ہے۔

ان ھوا الا ذکر للعلمین (آیہ)	یہ کتاب تمام عالم انسانی کے لئے ضابطۂ حیات ہے

اس کا ہر قانون جس طرح غریب طبقوں کے لئے ہے اسی طرح اونچے طبقوں یہاں تک کہ خلیفۂ وامیر پر بھی حاوی ہے۔ اس میں کسی قسم کی لچک نرمی اور پیچیدگی نہیں کہ آپ اسے اپنی خواہش کے مطابق ادھر ادھر پھیر سکیں۔

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی	اے ایمان والو عدل وانصاف کو قائم رکھو اور صرف اللہ کے لئے

انفسکم او الوالدین والاقربین (آیہ) | شہادت دو اگرچہ اس میں خود تمہیں یا تمہارے والدین یا رشتہ داروں کو نقصان اُٹھانا پڑے

اُمرت لاعدل بینکم (سورۂ شوریٰ) | مجھے یہ حکم ہوا ہے کہ میں تم میں (انسانوں میں) انصاف کر دوں۔

عن عبادۃ ابن الصامتؓ قال قال رسول اللہ صلعم اقیموا حدود اللہ علی القریب والبعید ولا تاخذکم فی اللہ لومۃ لائم (اخرجہ ابن ماجۃ۔ کتاب الحدود) | خدائی تعزیرات کا نفاذ اپنوں اور بیگانوں سب پر مساویانہ کرو اور تم کو اللہ کے بارے میں کسی ملامت کا خوف نہیں ہونا چاہیئے

اس خدائی کتاب اور محمد عربی صلعم کو ماننے والے لوگ "مومنین" کہلاتے ہیں۔ جن کا مقصدِ زندگی بس اسی قدر ہے کہ امن و مساوات کے اس آخری قانون کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیں کتاب و سنت کی عملی مثال بن کر انسان کو احکم الحاکمین کی حاکمیت کے تحت لا کھڑا کریں۔ اور انسان کے خود ساختہ معیارِ خیر و شر کو مٹا کر منشاء خداوندی کے مطابق اشیاء کی قدریں متعین کریں۔

کنتم خیر اُمۃٍ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ (آیہ) | مسلمانو! تمہیں ایک بہترین امت بنا کر نوعِ انسانی کی فلاح و نجات کے لئے بھیجا ہے (اور تمہاری بزرگی و

عظمت سی ہی ہے) کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور برائی
سے منع کرو اور اللہ کے ساتھ ایمان لاؤ

بانیٔ اسلام علیہ التحیۃ والسلام کی مقدس تعلیم یہی ہے کہ اسلامی نظامِ اجتماع کی بنیاد شرفِ انسانی اور وحدتِ فکر پر ہے۔

کونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری)	تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

حدیثِ نبوی کے اس ٹکڑہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسانوں کی اخوت کی اساس توحید اور عبودیت ہے۔

اللّٰھمّ ربّنا وربّ کل شیٔ انا شھد ان انّ العباد کلّھم اخوۃ (اخرجہ احمد وابوداؤد)	اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں

رسولِ کریم صلعم کے ان کلمات میں قابل غور بات یہ ہے کہ توحید و رسالت کے بعد اس امر کی شہادت دی گئی ہے کہ دُنیا کے سب انسان ایک ہی قومیت ہیں۔ ظاہر ہے کہ توحید و رسالت اسلام کے " مہات الامور " میں سب سے مقدم درجہ رکھتے ہیں۔ اور اخوتِ انسانی کو ان کے ساتھ ذکر کرنا اور پھر لفظ شہادت سے اسے موکد کرنا اس امر کو ظاہر کر رہا ہے کہ اخوتِ بشری بھی اسلام کا ایک بنیادی اصول ہے۔ لہٰذا کوئی ایسا نظامِ اجتماع جو اس عالمگیر وحدت انسانی کے بجائے نسل اور وطن کے

تصوّر پر مبنی ہو وہ اسلام کی نظر میں مردود ہے۔

مگر مشکل یہ ہے کہ اسلام کی دعوت جہاں دنیا کے پسماندہ طبقات کے لئے امن و راحت اور حریّت و آزادی کا پیغام ہے وہاں اعلیٰ طبقوں کے لئے پیغامِ ہلاکت ہے۔ اس لئے یہ لوگ جن کو قرآنِ حکیم مسرفین کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ اسلام کے راستہ میں ہمیشہ مزاحم بنتے ہیں۔ اگر کوئی جماعت اس خدائی نظریۂ اجتماع کو بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ تو اُسے لازماً سرمایہ دارانہ نظام سے متصادم ہونا پڑتا ہے اور یہ لوگ اپنے وقار دنیوی کو خطرہ میں دیکھ کر آخری حد تک اپنی قوت و طاقت کا استعمال کرتے ہیں مگر جو جماعت حق و صداقت کی علمبردار ہوتی ہے اور اپنے سینے میں نوعِ انسان کا درد لے کر اٹھتی ہے اُسے ان تمام مراحل سے پوری ہمت کے ساتھ گزرنا پڑتا ہے اور اس راہ میں اُسے ہر قسم کی اذیتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔

چوں اندیشم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ

(اقبالؒ)

اقوامِ عالم کی تاریخ کا سب سے تاریک تر اور درد انگیز پہلو انسانوں کی قبائلی، نسلی، لسانی اور جغرافی تقسیم ہے۔ جس پر ہمیشہ اخوّتِ انسانی کے مقدّس رشتہ کو قربان کیا جاتا رہا اور اس کی خاطر اخلاق و انسانیت کی تذلیل ہوتی رہی ہے۔ مگر اسلام کی دعوتِ حقّہ کا مقصد یہ

یہ ہے کہ عالم انسانی کو گروہی اور طبقاتی بندشوں سے نکال کر اسے ہمہ گیر اخوّت و مساوات کی رفعت عطا کرے اور ظالم و غاصب اور خود غرض انسانوں کو طاقت و اقتدار کی بلندیوں سے آتار اور پسماندہ طبقوں کو ذلّت و رسوائی کے عمیق گڑھے سے اٹھا کر سب کو نقطۂ عدل پر کھڑا کر دے

وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (حدید)	رسولوں کے ہمراہ ہم نے کتاب اور میزان بھی آتاری تاکہ سب لوگ صراطِ مستقیم پر کھڑے ہو جائیں

رسم و رواج کی مصنوعی حد بندیوں کو مٹا کر مخلوق خدا کو ضابطۂ خداوندی کے سامنے جھکا دیا جائے۔

وَیَضَعُ عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (آیہ)	نبی امی صلعم کو اس لئے مبعوث کیا کہ وہ عبودیت و غلامی کے طوق گراں کو ان سے آتار پھینکیں۔

رنگ و نسل اور جغرافی قیود کو ختم کر کے ایمان و عمل اور اخلاق پر شرف انسانی کی بنیادیں استوار کی جائیں۔

یا ایھا النّاس انا خلقنا کم مِن ذکر و انثیٰ وجعلنا کم شعوبًا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم (آیہ)	اے لوگو ہم نے تم کو پیدا کیا مرد اور عورت سے اور کئی گروہوں اور نسلوں میں تمہیں تقسیم کیا، صرف اس لئے کہ تم ایک دوسرے سے پہچانے جا سکو مگر عظمت و شرف

کا معیار اللہ کے یہاں خدا ترسی اور عمل وکردار ہے

لیس لاحد علی احد فضل الا بدین وتقوی (مشکوٰۃ)

دینداری اور خدا ترسی کے سوا کسی شخص کو کسی پر کوئی وجہ فضیلت نہیں۔

اگر پوری دیانتداری کے ساتھ اسلام کے صرف اس ایک باب کا مطالعہ کیا جائے۔ تو یقیناً اسلام کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا اور اس کے لئے دوسرے دلائل وبراہین کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اس ضمن میں پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کی عملی سیرت کو سامنے رکھا جائے کہ کہ انہوں نے کس طرح نہایت قلیل عرصہ میں زندگی کے ان اہم شعبوں میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کیا اور کس طرح قبائلی نسلی اور وطنی جذبات عصبیت کو مٹا کر مساوات عمومی سے لوگوں کو روشناس کیا۔

اُمتے بود کہ از اثر حکمت او
واقف سرِ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصل ما یک شررے باختہ رنگے بود است
یک نظر کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
(اقبالؒ)

محمد عربی صلعم کی عملی زندگی اس قدر اظہر من الشمس ہے کہ ساڑھے تیرہ سو سال کے بعد بھی آپ کی سیرت کا ایک واقعہ امر مشاہد کی طرح بیّن اور یقینی ہے۔ احادیث کا وہ ذخیرہ جس کی بنیاد روایت و درایت کے

مستند اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ آپ کی زندگی کی ایک ایک حرکت کو پیش کر رہا ہے۔ یہی مقدس سیرت ہمارا دستورِ عمل ہے اور اسی سے ہماری تومیت کی تکوین ہوتی ہے۔ امام الہند شاہ ولی اللہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

عربیت نسب عربیت لسان ہردو فخر ماست کہ مارا بسید الاولین و الآخرین و افضل الانبیاء والمرسلین و فخر موجودات علیہ و علےٰ آلہ التحیۃ والتسلیمات نزدیک می گردانند	عربیت نسب اور زبان کے لحاظ سے ہمارے لئے باعث فخر ہے جو ہمیں سیدالاولین و الآخرین افضل الانبیاء والمرسلین اور فخر موجودات علیہ السلام سے قریب کرنے والی ہے

دوسرے مقامات پر ارشاد فرماتے ہیں :-

شکر نعمتِ عظمیٰ آنست کہ بقدر امکان عادات و رسوم عرب اوّل کہ منشائے آنحضرت صلعم است از دست نداویم	اس سب سے بڑی نعمت کا شکر ہے کہ ہم نے عرب اوّل (عہدِ نبوت) جو آنحضرت صلعم کا منشاء ہے کی عادات و رسوم کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا

اپنی اسی وصیت میں آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں :-

رسوم عجم و عادات ہنود در میاں خود نہ گذاریم (الفرقان مجدد نمبر)	عجم کی رسموں اور ہنود کی عادات کو ہم اپنے اندر جگہ نہیں دیتے

مگر مسلمانوں کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے اس مکمل فلسفۂ زندگی سے پہلو تہی کر کے انسانی اصول و نظریات کی پیروی کرنا شروع کر دی کوئی لینن اور کارل مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت کا

مداح ہے اور کوئی محمد عربی صلعم کی سیرت کے بجائے گاندھی جی کے بے جان فلسفہ کا پیرو ہے۔ فیا للعجب!

چہ گویمت ز مسلمان نامسلمانے
جز ایں کہ پور خلیل است آزری داند

(اقبالؒ)

حقیقت یہ ہے کہ ہم دنیا کی عظیم ترین ملت ہیں دنیا کو ضرورت ہے کہ ہمارے فلسفۂ اجتماع کی ضیا ریزیوں سے استفادہ کرے نہ کہ ہم اندھا دھند دوسروں کی تقلید کرنا شروع کر دیں۔ اعاذنا اللہ منہ

اسلامی نظریۂ اجتماع کی ہمہ گیر افادیت

اسلام کا نظام اجتماع ان معصوم اور مقدس اصول و نظریات پر مبنی ہے جو انسان کے ذاتی امیال و عواطف اور اس کے طبقاتی و گروہی جذبات و تخیلات سے بلند تر ہیں یعنی یہ نظام حیات اپنی طبیعت کے اعتبار سے کسی انسانی گروہ کے مخصوص عارضی مفادات کی پیداوار نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل روح ایک زندہ جاوید اور ابدی حقیقت ہے، اور وہ ہے رب العالمین کی پرخلوص اور مکمل اطاعت۔ بس اسلام کے پورے نظام زندگی میں یہی روح جاری و ساری ہے اور زندگی کا کوئی بعید سے بعید گوشہ بھی اس کے اثر و نفوذ سے خالی نہیں، دستور سیاست ہو یا ضابطۂ اخلاق و تہذیب، نظام معاشرت و تمدن ہو یا آئین معیشت و اقتصاد غرض اسلامی نظام اجتماع کا ہر شعبہ اسی ایک اصل پر مبنی ہے۔ بلکہ انسان کی انفرادی زندگی کی ہر حرکت بھی اسی نقطۂ مرکز سے وابستہ ہے۔

قُل اِنَّ صلوٰتی و نُسُکی و محیایَ و مَماتِی لِلّٰہِ رب العالمین لا شریک لہ و بذالک اُمِرتُ و انا اوّل المُسلمین (آیت)	اے نبی! آپ لوگوں سے کہدیں کہ میری نماز، میری قربانی میری زندگی اور میری موت سب کچھ رب العالمین کے لئے ہے مجھے یہی حکم ملا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں۔

چونکہ اس نظریۂ زندگی کا تعلق براہ راست رب العالمین سے ہے اس لئے اس نظریۂ حیات کو مان لینے کے بعد وہ تمام اختلافات جو جغرافی حدود و ثغور نسلی، قبیلوی، لسانی اور ثقافتی امتیازات کی پیداوار ہیں اور اس عالمی نظریۂ حیات کے راستہ میں حائل ہیں خود ہی ختم ہو جاتے ہیں اور ہزار ہا انسانی طبقات کے بجائے ایک ہمہ گیر قومیت (انٹرنیشنلزم) بروئے کار آتی ہے اس عالمگیر اخوتِ انسانی میں وجہ جامعیت وہ ازلی اور ابدی حقائق ہیں جو زمانہ کے انقلابات کے باوجود لا یتغیر و لا یتبدل ہیں اور وہ انسانوں کے وطنی، معاشی اور سیاسی حالات و مقتضیات کے تابع نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس انسان کے تمام انفرادی اور اجتماعی تقاضے ان ابدی حقائق سے وجود حاصل کرتے ہیں۔ اور آخر تک ان کا ساتھ دیتے ہیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کسی فرد یا جماعت کے وقتی تقاضے ان حقائق سے اپنا تعلق منقطع کر لیں۔

یہ کتنی صاف اور بیّن حقیقت ہے کہ جس نظریۂ زندگی کی بنا رب العالمین کی ربوبیت عامہ اور انسانیت مطلقہ کی فلاح و بہبود ہے کیا وہ کسی مخصوص انسانی گروہ سے امتیازی سلوک کر سکتا ہے؛ علوم اسلامی کا مبتدی بھی اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ اسلام انسانوں کو جس معبودِ حقیقی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ قرآنی الفاظ میں "رب العالمین" ہے اور خدا کا آخری اور مکمل قانونِ ہدایت و سعادت یعنی قرآن حکیم "ذکر للعالمین" ہے اور جس مقدس اور جامع صفات شخصیت پر یہ

قانون خداوندی اتارا گیا ہے وہ "رحمتہ للعالمین" ہے۔
مگر اس کا کیا علاج کیا جائے کہ انسان نے خود ہی اس عالمی نظریۂ حیات کے برعکس کائنات انسانی کو سینکڑوں دوائر میں تقسیم کر دیا ہے اور ہر دائرہ انسانیت ایک مستقل اور جامد قوم (نیشن) بن کے رہ گیا ہے۔ جس کا نظریۂ زندگی اور طرز تمدن دوسرے دوائرے سے کلی تضاد رکھتا ہے۔ اور تعصب و تنگ نظری کا یہ حال ہے کہ دنیا کی یہ الگ الگ وحدتیں (یونیٹیز) زندگی کے ہر میدان میں باہم دست و گریباں رہتی ہیں۔ مگر اس کی اصلی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے؟ کہ یہ وطنی، لسانی اور نسلی قومیتیں ہر حیثیت سے باہم متضاد ہیں اور کوئی ہمہ گیر صداقت (یونیورسل ٹروتھ) ان میں وجہ اشتراک نہیں ہے۔ اور ان کے اجتماعی اور قومی مفادات کے تصادم نے نسل آدم کو عذاب الیم میں مبتلا کر رکھا ہے۔

موجودہ دور اجتماع و تمدن ایک ترقی یافتہ دور تصور کیا جاتا ہے جس کی نظر فریب چمک دمک نے ایک عالم کو محو حیرت بنا رکھا ہے اور جمہوریت و مساوات کے گیت اور نغمے ہر سمت سے سنائی دے رہے ہیں مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانوں کی کثیر آبادی زندگی کی تلخیوں سے اس قدر تنگ آچکی ہے کہ وہ زندہ رہنے کی نسبت موت کو ترجیح دیتی ہے آج دنیا کے جمہوری نظامات میں حریت عامہ اور انسانی مساوات کو پہلا درجہ دیا گیا ہے۔ مگر ان کے اعمال کے پورے نقشے میں کوئی ایک خانہ بھی ایسا

نظر نہیں آتا جہاں حقوقِ انسانی کے اس ادعائے باطل کو جگہ دی گئی ہو
مملکتِ انگلستان کے بنیادی دستورِ سیاست (کانسٹی ٹیوشن) میں پوری بلند آہنگی سے حقوقِ انسانی کا اعلان کیا گیا ہے جس کے رُو سے ملک کے ہر باشندہ کی آزادی فکر اور حریتِ انسانی کا حق تسلیم کیا گیا ہے مگر دنیا جانتی ہے کہ یہ اعلانات عملی دنیا میں کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہو سکے۔ چنانچہ شاہی خاندان کے افراد اور افرادِ رعیت میں جو قانونی، مجلسی، معاشی اور سیاسی حیثیت سے امتیازی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں بادشاہ اور اس کے خاندان کے تمام افراد ایک حد تک قانونی بندشوں سے آزاد ہیں کام اور محنت کے بغیر ہی کروڑوں روپے خزانۂ ملکی سے ہر سال حاصل کرتے ہیں۔ گویا ملکی فنڈ ان کی آبائی ملکیت ہے۔ نیز شاہی خاندان کا ہر فرد خواہ کتنا ہی نالائق کیوں نہ ہو دوسروں پر بہرحال فوقیت رکھتا ہے۔

یہ تو شاہی خاندان کا حال ہے۔ لیکن عام لوگوں میں بھی عقیدۂ وخیال اور رنگ و نسل کا تعصب جنون کی حد تک پہنچا ہوا ہے۔ سفید فام لوگ سیاہ فام لوگوں کے مقابلہ میں معصوم تصور کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے لئے یہی تقدس بس کرتا ہے۔ کہ ان کا چہرا سفید ہے اور کالے لوگوں کے لئے یہی گناہ کافی ہے کہ وہ سیاہ فام پیدا ہوئے ہیں۔ مگر یہ صرف مجلسی اور شہری حقوق تک ہی محدود نہیں بلکہ سیاسی اور ملکی معاملات میں بھی اسی قسم کا تعصب پایا جاتا ہے۔ اور اس کے باوجود دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے

دستورِ سیاست و اجتماع میں تمام انسانوں کے حقوق مساوی ہیں سے
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات

اب جمہوریہ امریکہ کا حال سنئے! امریکہ میں قریباً سوا کروڑ سیاہ فام حبشی آباد ہیں اور امریکہ کی مجموعی آبادی کے اعتبار سے ان کا تناسب نو فیصدی سے کچھ زائد ہے۔ جہاں تک اس ملک کی دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) کے دستورِ اساسی کا تعلق ہے۔ اس میں تمام باشندگانِ ملک بلا لحاظ رنگ و نسل مساویانہ حقوق رکھتے ہیں اور کسی کا حق دوسروں سے فائق نہیں۔ مگر جس وقت ہم عملی دنیا میں اس دستورِ حریت کی مٹی پلید ہوتے دیکھتے ہیں۔ تو بے اختیار رونا آتا ہے۔ کہ ان مدعیانِ حریت و مساوات کے ہاتھوں سیاہ فام انسانوں کی بھاری تعداد کس طرح مشقِ ستم بنی ہوئی ہے، مساوی حقوق تو بڑی بات ہے۔ ان کو تو انسانیت کے ابتدائی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا ہے آج تک کتوں سے بھی ایسا مکروہ سلوک نہیں کیا گیا جو اس مظلوم انسانی آبادی سے ہو رہا ہے۔ ان کی عزت و ناموس اور جان و مال سفید فام لوگوں کے ہاتھوں ہر وقت خطرہ میں ہے۔ جس گورے کا جی چاہے کسی بے گناہ حبشی کو پکڑ کر قتل کر دے۔ یا کسی معصوم حبشن کی عصمت دری کا ارتکاب کرے، اس کے خلاف قانون کو جنبش تک نہیں ہوتی۔ مگر کوئی حبشی کسی معمولی جرم کا ارتکاب کر بیٹھے تو اس کے لئے قانون کی ساری مشینری حرکت میں آ جاتی ہے۔ مجلسی، تعلیمی اور تہذیبی اعتبار سے ان کو ملیچھ تصور کیا جاتا ہے۔ ہوٹلوں اور تھیئٹروں میں جانے کی ان کو اجازت

نہیں بلکہ کسی حبشی کے لئے گورے کے پہلو میں بیٹھنا بھاری جرم تصوّر کیا جاتا ہے اور مدارس میں ان کا داخلہ ممنوع ہے۔ اس لئے کہ ان کے متعلق یہ نظریہ قائم کر لیا گیا ہے کہ یہ لوگ تعلیم کے اہل ہی نہیں۔ بلکہ یہ صرف شرفاء کی خدمت کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔

حبشی آبادی کا یہ بڑا جرم ہے کہ ان میں سے کوئی ایک جائیداد کا مالک بن جائے یعنی صاحب بہادر کی نظر میں یہ ایک ناقابل معافی گناہ ہے جس کی تلافی صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس غریب کی جائیداد پر غاصبانہ قبضہ کر لیا جائے۔

روس کے اشتراکی نظام کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے انسانوں کو تمام حقوق انسانیت عطا کر دیئے ہیں۔ بلکہ سوشلزم کے پرستار اس نظام زندگی کو کائنات انسانی کے لئے نعمت عظمٰے تصوّر کرتے ہیں۔ اور اس کی تعریف و توصیف میں ہر وقت رطب اللسان رہتے ہیں۔ مگر کیا یہ صحیح ہے؟ جہاں تک امر واقعہ کا تعلق ہے یہ قطعی غلط ہے کہ اشتراکی نظام نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اسے ضرورت ہے۔ اور اگر یہ صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو اس کی یہ فیاضانہ حکمت عملی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو اس کے ملحدانہ نظریات پر ایمان بالغیب لاتے ہیں اور جو لوگ اس کے لئے تیار نہ ہوں اُن کو تہ تیغ یا ملک بدر کر دیا جاتا ہے

ہندوستان کی تحریک آزادی کافی عرصہ سے چل رہی ہے۔ انقلاب فرانس کے بعد امریکہ کی جدوجہد حرّیت سے ہندوستان کی تحریک آزادی

بھی بہت کچھ متاثر ہوئی اور انقلاب روس کی صدائے بازگشت نے اس میں
اور بھی قوت پیدا کردی۔ یہاں تک کہ ہندوستان کے ہندو ارباب سیاست
تو روس کے انقلاب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے دل ودماغ میں
روسی اشتراکیت کے سوا کوئی چیز سما ہی نہیں سکی اور اب اشتراکیت (سوشلزم)
ہی ان کا مذہب بن گیا ہے چنانچہ ان لوگوں کے اعلاناتِ حریت پڑھ کر
یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی آزادی کے فرشتے ہیں جو ہندوستان اور ہندوستانیوں
کو آزاد کرانے کے لئے آسمان سے اترے ہیں مگر سخت افسوس ہے کہ
وہ اب تک بارہ کروڑ اپنے ہم مذہب بھائیوں کو انسانیت کے ابتدائی حقوق
دینے سے بھی قاصر رہے ہیں۔ اور آج بھی دنیا کی یہ مظلوم ترین آبادی ہر قسم
کے حقوقِ انسانی سے محروم ہے ان کے یہاں کتے اور خنزیر سے تو ہمدردانہ
سلوک کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شریعت میں یہ چیزیں پاک اور پوتر ہیں مگر
ان کے نزدیک یہ غریب انسان کسی شریفانہ سلوک کے مستحق نہیں اور یہ
پیدائشی ناپاک اور ملیچھ ہیں اور یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے
ایک ہی قوم ہیں، بلکہ گاؤ خور مسلمانوں سے بھی کہا جاتا ہے کہ تم ہمارے
بھائی ہو آؤ بھائیوں کی طرح مل کر ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کریں۔ مگر
اس کے جواب میں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

نو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ لازم آید ز تو احتراز کردن

یہ سب کچھ ان ممالک میں ہو رہا ہے۔ جہاں جمہوری یا نیم جمہوری قسم

کی حکومتیں قائم ہیں یا قیام جمہوریت کی جد و جہد کی جا رہی ہے اور جن کے دساتیر باطلہ میں یہ امر بنیادی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ملک و وطن کے تمام باشندے ہر قسم کے شہری حقوق میں مساوی الدرجہ ہیں۔

کوئی ایسا نظام اجتماع جس کی افادیت حدود وطن سے آگے نہ بڑھ سکتی ہو اس میں عالم انسانیت کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے جبکہ انسانی آبادی کسی ایک وطن ہی میں محدود نہیں بلکہ رُوئے زمین کی ناپیداکنار وسعت میں پھیلی ہوئی ہے اور یہ لاتعداد نسلِ آدم بھی استحقاقِ حریت و مساوات کے اعتبار سے ملک کی قدیم ترین آبادی سے کم نہیں ہے۔

اگر اسی تنگ نظری پر اکتفا کی گئی ہوتی تو اُسے نظر انداز کرنا بھی ممکن تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ دردناک حقیقت جو ہر ہوش مند انسان کو خُون کے آنسو رُلاتی ہے۔ یہ ہی کہ ان ممالک کے اصل باشندوں میں بھی رنگ و نسل اور عقیدہ و خیال کا اس قدر شدید تعصب پایا جاتا ہے کہ اس کے مظاہر مجلسی، معاشی اور سیاسی تفریق و امتیاز کی شکل میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں اور اُن کے ہموطنوں کے وہ طبقے جو بدقسمتی سے برسرِ اقتدار پارٹی کے ہم نسل یا ہم عقیدہ نہیں ہیں ان پر شہری اور انسانی حقوق کے دروازے بند کر دیئے گئے ہیں۔

انسانی مرض کی نوعیت

دُنیا کی مادہ پرست قومیں انسانیت کی بیماری کے علاج کے لئے ایک

عرصہ سے مسلسل تگ ودو کر رہی ہیں اور کسی ایسے اکسیری نسخہ کی طلب وجستجو میں انہوں نے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے۔ جو انسانیت کو زندگی کی تلخیوں سے رہائی دلا سکے مگر حیرت ہے کہ اس قدر جد وجہد کے باوجود ان کو اب تک یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ انسانیت کا حقیقی دکھ کیا ہے؟ اور اس کے علاج کے لئے کون سے دار الشفاء کی جانب رُخ کرنا چاہیئے۔

آپ نے فرانس کی تحریک حرّیت کا منشور آزادی دیکھا ہوگا اور امریکہ وروس کے اعلانات جمہوریت ومساوات بھی نظر سے گزرے ہوں گے۔ مگر کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ کی نگاہِ فلک رسا حرّیت ومساوات کے اس ازلی پیغام کی جانب بھی اٹھی ہوتی جو چھٹی صدی عیسوی میں بوقبیس کی پہاڑیوں سے سنا گیا تھا۔ اور جس نے انسانی دنیا کو ایک حیرت انگیز انقلاب سے روشناس کیا تھا۔ اور انسانیت کی لٹی ہوئی متاع نہ صرف انسانوں کو واپس دلائی بلکہ دُنیا کے غریب اور پس ماندہ طبقوں کو عزّت وشرف کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مادّہ پرست دُنیا کو یہ توفیق کہاں نصیب ہو سکتی ہے کہ اپنی زندگی کے چند لمحے اسلام کے اعلانِ حقوقِ انسانی کے مطالعہ میں بھی صرف کرے۔

تو اے گرد تو ہم شوکتِ دریا چہ می دانی
اسیرِ عذر تنگی وسعتِ صحرا چہ می دانی

جہاں تک مرض کی نوعیت کا تعلق ہے گذشتہ مباحث میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ موجودہ مصائبِ انسانی کا اصل سرچشمہ اقوام

حاضرہ کے طبقاتی، نسلی اور عصبیاتی نظام دیئے ہیں جنہوں نے انسان کو انسان کا دشمن بنا دیا ہے۔ اور جن کی وجہ سے آج کائنات انسانی ایک نہایت بھیانک اور دردناک دورِ مصیبت میں گرفتار ہے۔ یہی وہ حقیقی روگ ہے جو جسم انسانیت کو تیزی کے ساتھ کھائے جا رہا ہے مگر انسان کی عقل پر تعجب آتا ہے کہ وہ اس زہرِ ہلاہل کو تریاق سمجھ کر خوشی خوشی حلق سے اتار رہا ہے۔

اس مرض کا حقیقی علاج کیا ہے؟

فسادِ انسانیت کی اصلاح کے لئے درحقیقت کسی ایسے نظریۂ حیات کی ضرورت ہے جو ذیل کی صفات کا حامل ہو۔

(۱) جو انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات کا ضامن ہو اور اس میں تمام ابناءِ آدم کا مشترکہ مذہب بننے کی کامل صلاحیت موجود ہو یعنی اس کی بنا ہمہ گیر اور محیطِ کل اصول و نظریات پر ہو۔

(۲) اپنی جامع اور ہمہ گیر حیثیت کی وجہ سے کسی انسانی گروہ سے امتیازی سلوک نہ کرتا ہو بلکہ تمام ابناءِ نوع کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہو۔ یعنی جہاں تک انسانیت کے بنیادی حقوق کا تعلق ہے۔ نسلی شرافت، تمدنی وجاہت اور جغرافی قیود سے قطع نظر تمام انسانوں میں عدل و مساوات قائم رکھ سکتا ہو۔

گذشتہ مباحث میں دنیا کے دوسرے سماجی نظریوں کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اسلامی نظریۂ اجتماع ہی وہ محیطِ کل اور جامع نظریۂ

زندگی ہے جو تمام انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور اسی کی بنیادوں پر ایک عالمگیر قومیت (انٹرنیشنلزم) کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ یہاں صرف دوسری شق پر سرسری بحث کرنا مقصود ہے کہ اسلام کا نظریہ اجتماع و تمدن ہی بلالحاظ رنگ و نسل اور عقیدہ و خیال تمام انسانوں میں مجلسی، معاشی اور قانونی مساوات پیدا کر سکتا ہے۔

معاشرتی مساوات

اسلام کا نظامِ اجتماع و تمدن انسانوں کے کسی گروہ کو حقوقِ انسانیت سے محروم نہیں رکھتا بلکہ جہاں تک بنیادی حقوقِ انسانی کا تعلق ہے۔ ان میں نہ صرف یہ کہ مسلمان اور مسلمان میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتا بلکہ مسلم اور غیر مسلم بھی اس کی نظر میں یکساں ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نظامِ زندگی رب العالمین کی طرف سے انسانوں کے اس مقدس اور منتخب گروہ کو ملا ہے جس کا مقصدِ حیات خدا کی مکمل اطاعت اور انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے یعنی مسلم قومیت دورِ حاضر کی جغرافی اور نسلی قومیتوں کی طرح کسی قومیت کا نام نہیں بلکہ اس قومیت کی بنیاد چند ہمہ گیر اور مقدس اصول و عقائد پر ہے' اور ان اصولوں کو ماننے کے بعد ہر انسان خواہ لیبیا کا حبشی ہو یا پیرس اور لندن کا مہذب شہری عرب ہو یا عجم اس بین الاقوامی برادری کا معزز رکن بن سکتا ہے۔ حبشہ کے بلال حبشی اور روم کے صہیب رومی دربارِ رسالت میں شرفاءِ مکہ سے زیادہ قابلِ احترام خیال کئے جاتے ہیں اور فارس کے سلمان فارسی کو تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے

اہلِ بیت ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے وقت کے باجبروت خلیفہ عمر فاروقؓ حضرت بلالؓ کو اپنا آقا کہتے ہیں فخر محسوس کرتے ہیں اور مرتے وقت یہ وصیت فرماتے ہیں کہ میری نماز جنازہ صہیب رومیؓ پڑھائیں گے مگر رسول ہاشمی صلعم کے اپنے ہموطن ــــ نہیں بلکہ ہم نسل اور قرابت دار اور اس سے بھی بڑھ کر قریش مکہ کے مقتدر لیڈر ــــ ابوجہل کو اس قومیت سے دُور کی نسبت بھی نہیں ہے۔

یہ تو مسلم قومیت کی حقیقت ہے مگر انسانیت کے بنیادی حقوق میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں حکومت اسلامی کے ماتحت رہنے والی جملہ اقوام کو ہر قسم کے شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ غیر مسلموں کے مجلسی اور معاشی حقوق کا پورا احترام کیا جاتا ہے یعنی اسلامی جمہوریت کی افادیت صرف حجاز مقدس یا جزیرۂ عرب ہی تک محدود نہیں بلکہ تمام ابناء آدم اس کی فیض باریوں سے مستفید ہوتے ہیں۔

اسلام نے نہ صرف مسلمانوں میں ذات پات اور قبیلہ و نسب کے جاہلی تصورات کا خاتمہ کیا اور اعلیٰ و ادنیٰ حیثیت رکھنے والوں کو باہم بھائی بھائی بنا دیا ـ بلکہ غیر مسلموں سے بھی شریفانہ اور مساویانہ سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ فقہی قانون آج بھی اسلامی فقہ کی مستند کتابوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

فان قبلو ھا فلھم ما للمسلمین و علیھم ما علی المسلمین۔	اگر وہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو وہ ہر قسم کے نفع و نقصان (حقوق انسانی) میں مسلمانوں کے ساتھ شریک ہیں۔
(ھدایہ کتاب السیر)	

صحابۂ کرام کے زمانہ میں غیر مسلم ذمیوں سے ہر قسم کے معاشرتی، تمدنی اور مجلسی تعلقات رکھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے پڑوس میں ایک یہودی

رہتا تھا، ایک دفعہ انھوں نے بکری ذبح کی تو گھر والوں سے دریافت فرمایا کہ تم نے اپنے پڑوسی کو گوشت بھیجا ہے؟ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلعم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے "کہ مجھ کو جبریل علیہ السلام نے ہمسایوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ ان کو وارث بنا دیا جائیگا۔

درحقیقت حسن معاشرت، تمدن کی روح ہے اور اسی سے انسانوں کی باہم رفاقت و محبت کے پُرخلوص جذبات کا پتہ چل سکتا ہے لیکن تاریخ اسلامی گواہ ہے کہ صحابہ کرام کے طرز معاشرت اور حسنِ معاملہ نے غیر مسلموں کے دلوں میں غیر متزلزل عقیدت پیدا کر دی تھی اور وہ ان پر ہر طرح کا اعتماد کرتے تھے۔

حضرت عمر بن الخطابؓ نے فتح شام کے بعد ابوعبیدہ بن الجراحؓ کو ایک فرمان بھیجا جس میں یہ الفاظ بھی تھے۔

آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے نقصان

وامنع المسلمین من ظلمهم	آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے نقصان
والاضرار بهم واکل	پہنچانے اور ان کا مال کھانے سے روک دیں
اموالهم واوف لهم بشرطهم	اور تم نے ان کے حقوق کے بارے میں
الذی شرطت لهم فی جمیع ما	جو شرطیں ان سے طے کی ہیں، ان کا پوری
أعطیتهم (کتاب الخراج ص ۸۲)	طرح ایفاء کریں۔

صحابہ کے حسن معاشرت اور بلندی اخلاق ہی کا یہ اثر تھا کہ غیر مسلم اپنے ہم مذہب عیسائیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے دست و باز و بن گئے تھے۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں تحریر فرماتے ہیں۔

فلما رای اهل الذمة وفاء	جب ذمیوں نے مسلمانوں کا ایفاء عہد اور

المسلمین وحسن السیرة فیھم	حسن اخلاق دیکھا تو وہ اعدائے مسلمین کے
صاروا اشد اء علی عدو المسلمین	مقابلہ میں مسلمانوں کے معاون بن
دعونا للمسلمین علی اعدائھم	گئے۔

ایک مرتبہ جب حضرت عمرؓ کی خدمت میں ان لوگوں کا وفد آیا تو آپ نے ان سے پوچھا کہ مسلمان تم لوگوں کو ایذاء تو نہیں دیتے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

مانعلم الا وفاءً وحسن ملکة	ہم ان کے متعلق ایفاء عہد اور شریفانہ اخلاق
(طبری صفحہ ۲۵۶)	کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

مسلمانوں نے جب شام کا علاقہ حمص فتح کیا تو وہاں کچھ عرصہ اپنی چھاؤنی قائم کی اور شہر والوں سے انھوں نے ایک سال کا خراج وصول کر لیا۔ مگر چند ناگزیر حالات کی بنا پر ان کو یہ علاقہ چھوڑنا پڑا، حضرت عمر نے حکم بھیجا کہ ان لوگوں سے جس قدر خراج وصول کیا گیا ہے وہ واپس کر دیا جائے کیونکہ یہ خراج ان کی حفاظت کے عوض میں لیا گیا تھا۔ اور اب جبکہ حفاظت نہیں تو خراج کیسا؟ مسلمان جب وہاں سے رخصت ہوئے تو وہاں کے عیسائی زار و زار رو رہے تھے اور مسلمانوں سے التجائیں کر رہے تھے کہ خدا کیلئے تم جلدی واپس آنا کہ کہیں رومن عیسائی دوبارہ ہم پر حکومت کرنے کو نہ آپہنچیں اور جب ان کے ہم مذہب عیسائیوں نے دوبارہ ان پر حملہ کیا تو ان لوگوں نے گھروں کے دروازے بند کر لئے اور ان کو صاف جواب دے دیا کہ تم یہاں سے نکل جاؤ مسلمانوں کی حکومت تم سے ہزار درجہ بہتر ہے۔

تو نخلِ خوش ثمرے کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش بریدند و با تو پیوستند

معاشی مساوات

اسلام کا معاشی نظام اگرچہ ایک مستقل موضوع بحث ہے مگر یہاں اختصار کے ساتھ صرف اسی قدر بتانا ہے کہ حکومت اسلامی میں غیر مسلم رعایا کو جس طرح معاشی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ وہ موجودہ جمہوری حکومتوں میں ان کے ہموطن اور ہم نسل لوگوں کو بھی حاصل نہیں ہیں۔

آج دنیا کی حکومتیں خواہ خالص جمہوری (ڈیموکریٹک) ہوں یا دستوری اور پارلیمنٹری برسر اقتدار پارٹیاں اور اشخاص ملک کے خزانہ سے جسطرح چاہیں خرچ کرتے ہیں اور کروڑوں روپئے ان کے ذاتی مصارف، پارٹی پراپیگنڈے اور دیگر مصالح کی نذر ہو جاتے ہیں اور ملک کے غریب طبقے نہایت مشکل سے گزر اوقات کرتے ہیں مگر اسلام کا خلیفہ خزانۂ ملی سے ایک حبہ تک خرچ نہیں کر سکتا اور معاشی اعتبار سے اس کی حالت ملک کے عام باشندوں کی طرح ہوتی ہے وہ بیت المال سے سال میں کپڑوں کے صرف دو جوڑے اور عام لوگوں کی طرح معمولی خوراک حاصل کر سکتا ہے چنانچہ فاروق اعظمؓ خود اپنے مصارف ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

اُخبرکم بما یستحل لی منہ	میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بیت المال
حلتان حلۃ فی الشتاء وحلۃ	سے میں کس قدر لے سکتا ہوں؟ دو جوڑے
فی القیظ وما احج علیہ واعتمر من	کپڑے ایک سردیوں اور دوسرا گرمیوں کیلئے
الظھر وقوتی وقوت اھلی کقوت	ایک سواری جس پر میں حج اور عمرہ کرسکوں
رجلٍ من قریشٍ لا باغناھم ولا	اور قریش کے متوسط الحال آدمی کی طرح

یافقرھم ثم انا بعد ذالک رجل من المسلمین یصیبنی ما اصابھم	میرا اور میرے اہل وعیال کا کھانا۔ اس کے بعد عام مسلمانوں کا ایک فرد ہوں اور ہر
(ابن سعد ج ۳ ص ۱۹۸)	بات میں ان کا شریک حال ہوں۔

خلافت اسلامی میں کسی شخص کو بھوکا اور تنگدست نہیں رہنے دیا جاتا۔ بلکہ ہر مذہب وملت کے معذور، ناتواں اور غیر مستطیع لوگوں کی کفالت بیت المال کے ذمہ ہوتی ہے چنانچہ حضرت خالدؓ نے حیرہ کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں ایک اہم شق یہ تھی۔

ایما شیخ ضعف عن العمل او اصابۃ آفۃ من الآفات او کان غنیاً فافتقر وصار اھل دینہ یتصدقون علیہ طرحت جزیتہ وعیل من بیت مال المسلمین وعیالہ	جو بوڑھا شخص کام اور محنت سے معذور ہو جائے یا اس کا جسم ماؤف ہو جائے یا وہ مالدار تھا اور اب غریب ہو گیا ہے کہ اس کے ہم مذہب اُسے غریب سمجھکر اس پر صدقہ وخیرات کرنے لگے ہیں تو اسکا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اور اسکی اور اس کے اہل وعیال کی پرورش
(کتاب الخراج ص۸۵)	بیت المال کے ذمہ ہوگی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں ایک حاکم کو لکھا کہ ذمیوں کے ساتھ نرمی کرو۔ ان میں جو ضعیف العمر یا نادار ہو جائے اس کی کفالت کرو۔

خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں غیر مسلموں کو تجارت کی کھلی آزادی تھی۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ان کے تجارتی ٹیکس میں تخفیف کر دی گئی۔ چنانچہ شام کے قبطی

اپنا مال تجارت مدینہ میں لاتے تھے اور حضرت عمرؓ نے ان کا محصول نصف کر دیا تھا۔

سیاسی اور ملکی حقوق

غیر مسلم رعایا کو باقاعدہ ملکی امور میں حصّہ دار بنانا اسلام ہی کی خصوصیت ہے موجودہ حکومتیں اپنی ہموطن اور ہم قوم اقلیتوں کو ہر قسم کے اقتدارِ حکومت سے دور رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور ملک کی جس پارٹی کے ہاتھ میں اقتدار آجاتا ہے۔ وہ دوسری پارٹیوں کو ہر طرح کچلنے اور سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے ان کو کمزور بنانے کی ہر ممکن جد و جہد کی جاتی ہے۔ مگر عہد خلافت راشدہ میں ذمیوں کو بڑے بڑے ذمہ دارانہ عہدے تفویض کئے گئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک عیسائی کو جس کا نام ابو زبیدہ تھا۔ عامل مقرر کیا، حضرت عثمانؓ نے ایک عیسائی کو تعلیم دے کر اپنا میر منشی بنایا اور امیر معاویہؓ نے ابن آثال کو جو ایک نصرانی تھا حمص کا کلکٹر مقرر کیا۔

مذہبی آزادی

خلافتِ اسلامیہ میں غیر مسلم رعایا کو ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل تھی اوقاتِ نماز کے علاوہ ان کو ہر وقت اجازت تھی کہ وہ اپنی عبادت گاہوں میں اپنے مذہبی مراسم ادا کریں۔

علی ان یضربوا نواقیسهم فی ای ساعۃ شاؤا من لیل او نهار الا فی اوقات الصلوٰۃ	وہ نماز کے اوقات کے سوا ہر وقت ناقوس بجا سکیں گے۔

(کتاب الخراج)

حضرت عمرؓ نے اپنے عیسائی غلام کو اسلام کی دعوت دی مگر اس نے انکار کیا تو آپ نے فرمایا لا اکراہ فی الدین دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں اور وفات کے وقت اُسے گلے لگا لیا اور فرمایا تم جہاں جی چاہے جا سکتے ہو۔

قانونی مساوات

دنیا کے کسی نظامِ حکومت میں یہ بات نظر نہیں آئیگی کہ بلا لحاظ عقیدہ و خیال اور بلا تمیز رنگ و نسل تمام انسانوں پر ایک ہی قانون حاوی ہوا ور کوئی بڑے سے بڑا انسان یہاں تک کہ ملک کا سب سے بڑا حکمران بھی قانون کی گرفت سے مستثنیٰ نہ ہو یہ خصوصیت بھی اسلام ہی میں آپ کو ملے گی کہ مسلمانوں کا خلیفہ بھی اگر کسی جرم کا ارتکاب کرے تو وہ اُسی سزا کا مستوجب ہوگا جو کسی معمولی سے معمولی شہری کو دی جاتی ہے۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کو روم کے دربار میں بطور سفیر بھیجا گیا اور وہ بے دھڑک رومی سردار کے طاغوتی تخت کے پاس جا بیٹھے ان کے اس طرز عمل پر شاہی حاشیہ برداروں نے اعتراض کیا، اس کے جواب میں آپ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے وہ زمانۂ حاضر کے پرستارانِ جمہوریت و مساوات کے لئے سرمۂ بصیرت کا کام دے سکتے ہیں۔

امیرنا رجل منا ان عمل فینا بکتاب	ہمارا امیر ہم ہی میں سے ایک فرد ہے اگر وہ
دیننا وسنة نبینا قدرناه علینا	ہمارے دین کی کتاب اور ہمارے نبی کی
وان عمل بغیر ذالک عزلناه	سنت پر عمل کرے تو ہم اُسے فلاذت کا
عنا وان هو سرق قطعنا یده	اہل تصور کرتے ہیں ورنہ اُسے معزول

وان زنا جلدناه وان شتم رجلا منا شتمناه بما شتمه وان جرحه اقادہ من نفسه لایحتجب منا ولا یتکبر علینا ولا یستأثر علینا فی فیئنا الذی افاءه الله علینا وھو کرجل منا۔

(فتوح الشام ص۱۰۵)

کر دیتے ہیں۔ اگر وہ چوری کرے تو ہم اس کا ہاتھ کاٹ ڈالتے ہیں اگر وہ زنا کرے تو اس کو سنگسار کرتے ہیں۔ اگر وہ ہم میں سے کسی کو گالی دے تو اسے گالی کا گالی سے جواب دیا جاتا ہے۔ اگر وہ کسی کو زخمی کر دے تو اسے اس کا بدلہ دینا پڑتا ہے۔ وہ ہم سے چھپ کر ایوان شاہی میں نہیں بیٹھتا نہ وہ تکبر کرتا ہے اور نہ وہ مال غنیمت میں اپنی ذات کو ترجیح دے سکتا ہے۔ وہ ہماری طرح کا ایک آدمی ہے۔

چنانچہ عہد خلافت راشدہ میں مسلمانوں اور ذمیوں میں ایک جیسا سلوک کیا جاتا رہا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک یہودی قتل کر دیا گیا۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو فرمایا میرے دورِ خلافت میں اس طرح انسانوں کا خون ہو، میں تمہیں خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ جسے قاتل کا علم ہو مجھے بتائے!

ایک دفعہ حیرہ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا۔ عمر بن عبدالعزیزؒ نے وہاں کے گورنر کو لکھا۔ کہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالے کر دیا جائے، چنانچہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالے کر دیا گیا۔ چنانچہ قاتل کو مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے اُسے قتل کر دیا۔

بلکہ شاہی خاندان کے افراد اور ذمیوں سے برابر کا سلوک کیا جاتا تھا چنانچہ

ہشام ابن عبدالملک نے ایک عیسائی کے خلاف مقدمہ دائر کیا حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان دونوں کو برابر کھڑا کیا، ہشام نے شاہی غرور میں عیسائی کو سخت کلمے کہہ دیئے تو عمر ثانیؒ نے اس کو سختی سے ڈانٹا اور سزا کی دھمکی دی۔

اسلام میں غیر مسلم ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے برابر قرار دی گئی ہے

ان ابابکرؓ وعمرؓ کانا یجعلان دیة الیھودی والنصرانی اذا کانا معاھدین دیة الحر المسلم	حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ یہودی اور نصرانی اہل الذمہ کی دیت، آزاد مسلمان کے برابر قرار دیتے تھے۔
(دارقطنی کتاب الحدود)	
قال علیؓ من کان لہ ذمتنا فدمہ کدمنا ودیتہ کدیتنا۔	حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ذمیوں کا خون ہمارے خون کے برابر ہے (قصاص میں) اور ان کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔
(رواہ الدارقطنی فی سننہ)	

ان حقائق سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا نظام اجتماع و سیاست کس طرح انسانوں میں عملی مساوات پیدا کرتا ہے، اور وہ کسی ایک گروہ سے محض سیاسی یا مذہبی عقیدہ کے اختلاف اور رنگ و نسل کی تمیز اور جغرافی قیود کی بنا پر کسی قسم کی ناانصافی کا برتاؤ نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے پیش نظر انسانیت مطلقہ کی فلاح و نجات ہے۔

اسلامی اجتماع و تمدّن کے چند اہم اجزاء

اسلام کا جہاد ملی

اسلام کی نظر میں وطن اور رنگ و نسل کا رشتہ حقیقی رشتہ نہیں جو مسلمان کو جنگ کے لئے آمادہ کر سکے بلکہ اسلام نے مسلمانانِ عالم میں ایک مضبوط، پائدار اور حقیقی رشتہ قائم کر دیا ہے اور وہ ہے ایمان و عمل! اسی رشتہ میں مسلمان کے لئے کشش و جاذبیت ہے اور اسی کی خاطر وہ سربکف رہتا ہے۔ ہاں! اسلام سے قبل اقوام عالم اپنے مخصوص وطنی، ملکی اور قبیلوی مفاد کے تحفظ کیلئے لڑتی تھیں او نچے طبقے کے لوگ اپنے اقتدار کے نشے میں کروڑوں مظلوم و بیکس انسانوں کی تمناؤں کو موت کی آغوش میں سلا دیتے تھے نسل و قبیلہ کی عظمت و برتری اور خاندانی وجاہت ان کی جد وجہد کا نقطۂ مرکز تھی۔ اور اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نسلی اور قبیلوی مفاد کے لئے وہ سب کچھ کر گزرتے تھے جو اخلاق و انسانیت کے لئے باعثِ ننگ ہوتا ہے۔ مگر اسلام نے آکر اس ظالمانہ طرز فکر و عمل کو یکسر بدل دیا اور انسانوں کی جد و جہد کے لئے صرف ایک ہی مرکز قرار دیا۔

قاتلوا حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ (آیہ	مسلمانو! تم اس وقت تک لڑتے رہو جب تک کہ دنیا سے شر و بدعت کا فتنہ مٹ نہ جائے اور دین (اطاعت) صرف اللہ

عن ابی موسیٰ قال جاء رجل النبی صلعم فقال یارسول اللہ فان احدنا یقاتل غضباً و یقاتل حمیۃ فقال من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ (بخاری)

ایک شخص حضور کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا یارسول اللہ ہم میں سے کوئی ذاتی عناد و رنجش کے لئے اور کوئی نسلی عصبیت کیلئے لڑتا ہے فرمایا کہ صرف کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے لڑنا ہی جہاد فی سبیل اللہ ہو سکتا ہے۔

عن سعید ابن جبیرؓ قال خرج علینا عبد اللہ بن عمرؓ فرجونا ان یحد ثنا حدیثاً حسناً فبادرنا الیہ رجل فقال یا ابا عبد الرحمن حدثنا عن القتال فی الفتنۃ واللہ یقول وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ فقال ھل تدری ما الفتنۃ ثکلتک امک انما کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل المشرکین وکان الدخول فی دینھم فتنۃ ولیس کقتالکم علی الملک

(بخاری کتاب الفتن)

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ ہمارے ہاں تشریف لائے اور ہماری خواہش تھی کہ وہ کوئی اچھی حدیث بیان فرمائینگے۔ ہم میں سے ایک آدمی آگے بڑھا اور عرض کیا۔ اے ابو عبد الرحمٰن قتال فی الفتنہ کے متعلق ہم سے کوئی حدیث بیان کیجئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تم یہاں تک جہاد کرو کہ فتنہ مٹ جائے: عبد اللہ ابن عمرؓ نے فرمایا تم جانتے ہو کہ فتنہ کیا ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین سے جہاد و قتال کرتے تھے تو اسلئے کہ مشرکین کے دین میں داخل ہونا فتنہ تھا اور وہ تمہاری طرح ملک و وطن کی خاطر نہیں لڑتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ، نسل، قوم اور وطن زمانۂ جاہلیت کے وہ اصنام باطلہ ہیں جن کو زمانۂ رسالت کے جانباز مسلمانوں نے چور چور کر دیا تھا۔ مگر یہ زمانہ کی نیرنگیاں ہیں کہ جن بتانِ آذری کو ہم نے اپنے ہاتھوں سے ریزہ ریزہ کیا تھا۔ آج ان کے آگے ہمارا ہی سرِ نیاز خم ہو رہا ہے۔

چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا
پرستد مؤمن و کافر ترا شند (اقبال)

اس سلسلہ میں عہد نبوت کا صرف ایک واقعہ پیش کیا جاتا ہے۔

مدینہ منورہ میں "قزمان" نامی ایک شخص تھا جس کی نسبت سرکارِ دو عالم نے فرمایا تھا کہ یہ جہنمی ہے۔ یہی شخص غزوۂ احد میں نہایت قوت سے لڑ کر شدید زخمی ہوا، مسلمانوں کو حضورؐ کے ارشاد پر بہت تعجب ہوا۔ کہ جو شخص اتنی بہادری سے لڑ کر زخمی ہوا ہے وہ دوزخی کیسے ہو سکتا ہے؟ انھوں نے اس شخص کے پاس جا کر کہا کہ تجھے مبارک ہو کہ تو اللہ کے راستہ میں شہید ہوا ہے۔ اس نے جواب دیا، میں اور کسی چیز کو نہیں جانتا مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ مدینہ والوں کی مکہ والوں سے لڑائی ہے اور غیرتِ وطنی نے مجھے مدینہ والوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کیا۔ اس پر صحابہؓ کو ارشاد نبوی کی نسبت یقین آ گیا کہ یہ شخص واقعی جہنمی ہے۔

دنیا کی دوسری اقوام سے بحث نہیں کہ ان کے دواعی عروج اور اسباب ترقی کیا ہیں؟ ہر قوم کی اپنی تاریخ، اپنی روایات اور جداگانہ قومی مزاج ہے۔ مگر مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ جن مخصوص اجزاء فکر و عمل سے بنتی ہے ان کی طلب و

جستجو ہی ہماری مشکلات کا واحد حل ہے اس سلسلہ میں کتاب وسنت اور قرنِ اول کی قومی جد وجہد کے سارے اسباق کو از بر کرنے کی ضرورت ہے اور پھر اس عہد کا تعین بھی لازمی ہے جہاں سے ہماری حیات ملی میں اختلال رونما ہوا جسے ہم مبدأ فساد سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس عہد سے لے کر اب تک جس قدر مفاسد ہماری اجتماعی زندگی میں رونما ہو چکے ہیں۔ ان کی صحیح تشخیص کے بعد ہماری جد وجہد کا آغاز بالکل ملت کی تعمیر اول کے نہج و اسلوب پر ہونا چاہیئے۔

لن یصلح اخو ھذہ الامۃ الا بما صلح اولھا — مسلمانوں کے دور آخر کی اصلاح اسی فکر و عمل سے ہو سکتی ہے جس سے دورِ اول کے مسلمانوں کی اصلاح ہوئی۔ دانسؒ

مگر ماضی قریب میں اسلامی فکر کی جگہ فکرِ فرنگی نے لے لی تھی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلامی کو قدم قدم پر ناکامی و نامرادی سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اب مسلسل ناکامیوں کے بعد انہیں بھولا ہوا سبق یاد آنے لگا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج اسلامی دنیا کے حالات نہایت تیزی سے بدلتے جا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو وہ دن دور نہیں کہ ملتِ اسلامیہ اپنے عزائم ملی میں کامیاب ہو کر رہے گی۔

"پھر ترا دور بھی آنے کو ہے اے فقیرِ غیور"

تنظیم ملی کی اساس

آج تک مسلمانوں کی تنظیم کے لئے جتنی راہیں اختیار کی گئیں وہ اسلامی نظریہ اجتماع کے سراسر منافی تھیں اسلام کسی ایسی تنظیم کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا جس کی بنیاد قبیلہ، خاندان، نسل اور وطن ہو۔ یا اس کا ڈھانچہ اسلام

اور کفر کی غیر فطری ترکیب سے بنا ہو۔

مسلم اور غیر مسلم کے اغراض و مقاصد اور سیاسی نقطۂ نظر میں زمین و آسمان کا فرق ہے مسلمان آزادی اس لئے چاہتا ہے کہ خدا کی زمین میں خدائی نظریۂ اجتماع کا نفاذ کرے اور دوسری اقوام کی جد و جہد آزادی کا مقصد یہ ہے کہ انہیں پیٹ بھر کر کھانا ملے ملک کے افلاس کا خاتمہ ہو جائے یا زیادہ سے زیادہ اقتدارِ حکومت بدیشی ہاتھوں سے اہل وطن کے ہاتھوں میں منتقل ہو جائے جن دو قوموں کے طرزِ فکر اور سیاسی نقطۂ نظر میں اتنا تضاد موجود ہو ان کو کسی ایک جماعتی نظام میں کس طرح جکڑا جا سکتا ہے؟

مسلمانوں کو قبیلوی، نسلی اور وطنی عصبیت کی بنیادوں پر منظم کرنا دورِ جاہلیت کی بدترین لعنت ہے، جسے اسلام نے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔ مگر مسلمانوں نے ازسرِنو اس جاہلی تصور کو اپنی اجتماعی زندگی میں داخل کر لیا ہے اور عہدِ فتن کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک برابر اس بت کی پرستش ہو رہی ہے۔

عہدِ نبوت میں مسلمانوں کی تنظیم خالص فکرِ اسلامی پر ہوئی، کبھی ہاشمی غیر ہاشمی عرب غیر عرب کا سوال نہیں کھڑا کیا اور کسی فرد یا جماعت کی طرف سے یہ سوال اٹھا بھی تو اس کو اسی وقت دبا دیا گیا۔

غزوۂ حنین کے بعد تقسیم اموال کے سلسلہ میں انصار کے کچھ نوجوانوں نے کہہ دیا کہ ہماری تلواروں سے اب تک قریش کا خون خشک نہیں ہوا مگر تقسیم متاع میں ہمارا حصہ بھی قریش کو دیا جا رہا ہے۔

ان سیوفنا لتقطر من دماء قریش

وغنائمنا ترد علیھم ۔ بخاری

یہ بات کسی طرح رسولِ ہاشمی صلعم کے کانوں میں جا پہنچی۔ اس پر انصار کو طلب کیا گیا اور حضورؐ نے دریافت فرمایا کیا تم نے یہ بات کہی ہے؟ مگر انصار کی گردنیں مارے شرم کے جھک رہی تھیں، کہا یا رسول اللہ آپ نے جو کچھ سُنا وہ درست ہے اس پر آپ نے ایک دل ہلا دینے والا خطبہ ارشاد فرمایا جس کے ایک ایک لفظ نے آگ پر پانی کا کام دیا۔ آخر میں آپ نے فرمایا "تمہارے لئے یہ کافی نہیں کہ دوسرے سونا اور چاندی لے کر گھروں کو واپس جائیں اور تم اللہ کے رسول کو ساتھ لے جاؤ؟ اس پر انصار فرطِ مسرت سے کود پڑے اور یہ نعرہ لگایا۔ "رضینا باللہ رباً وبمحمدٍ نبیاً۔

غزوۂ بنی المصطلق میں ابن سعید غفاری (جو حضرت عمرؓ کا اجیر تھا) اور سنان الجہنی (جو عبداللہ ابن سلول کا حلیف تھا) میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ غفاری نے جہنی کی کمر پر گھونسا دے مارا۔ اس پر اس نے مدینہ والوں کو پکارا اور غفاری نے مہاجرین سے امداد طلب کی اور غصے کی حالت میں یہ بھول گئے کہ اسلام نے مکی اور مدنی کا تفرقہ مٹا دیا ہے۔ آنحضرت صلعم نے جب "یا للانصار" اور "یا للمہاجرین" غیر مانوس آواز سنی تو فرمایا۔

مابالُ دعوی جاھلیۃ، یہ جاہلیت کی پکار کیا ہے؟ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ ایک مہاجر نے ایک انصار کو پیٹا ہے۔ تو اس پر حضور نے ارشاد فرمایا۔

دعوھا فانھا منتنۃ، وخبیثۃ (بخاری) — اس نعرہ کو چھوڑ دو کہ یہ نہایت ناپاک یا باخبیث نعرہ ہے۔

ترمذی شریف اور دیگر کتب حدیث میں آیا ہے کہ عبداللہ ابن سلول کو ایک سنہری موقعہ ہاتھ آگیا اور اس نے انصار کو وطن اور نسل کے نام پر ابھارنا چاہا۔ کہا یہ لوگ ہمارے ٹکڑوں سے پلے ہیں اور آج ہمارے ہی مقابلہ پر اتر آئے ہیں؛ تم آئندہ کے لئے ان کو کچھ نہ دینا کہ خود ہی بھوک سے تنگ آکر مدینہ سے بھاگ جائیں گے۔

هم الذين يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا	یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں رسول اللہ کے ساتھیوں کو کوئی چیز نہ دو کہ وہ خود ہی یہاں سے بھاگ جائیں

اور پھر اس بدبخت نے یہاں تک کہدیا کہ

يقولون لئن رجعنا الى المدينة ليخرجن الاعز منها الاذل (منافقون)	جب ہم مدینہ واپس جائیں گے تو ہمارے معزز لوگ ان ذلیل لوگوں کو باہر نکال دیں گے۔

رئیس المنافقین کی یہ باتیں حضرت زید ابن ارقم نے سنیں اور حرف بحرف اپنے چچا سے آکر کہدیں اور چچا نے حضور کی خدمت میں عرض کیں اس پر آنحضرت نے عبداللہ ابن سلول کو طلب فرمایا۔ حضرت عمرؓ پاس کھڑے تھے، عرض کیا یارسول اللہ اگر اجازت ہو تو اس بدبخت کی گردن اڑا دوں؟ اب عبداللہ نے قسم کھا کر انکار کردیا۔ نبی کریمؐ نے اس کی قسم کی تصدیق فرمائی۔ مگر جب زید ابن ارقم کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضور نے عبداللہ کو سچا مان لیا ہے۔ تو ان کو بہت صدمہ ہوا ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ ساری عمر میں مجھے اتنا رنج کبھی نہیں ہوا۔ جتنا کہ اس بات سے ہوا کیونکہ اس معاملے میں وہ جھوٹے قرار دیئے

گئے تھے اور صحابہؓ جھوٹ کو سب سے بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔ چنانچہ جب مدینہ واپس آئے تو گھر کی چار دیواری میں چھپ کر بیٹھ گئے اور کئی دن تک شرم کے مارے باہر قدم نہ رکھا۔ یہاں تک کہ خدائے قدوس نے خود ان کی تصدیق کی۔ اور منافقین کے مکر و فریب کو عیاں کر دیا۔

"ترمذی" کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ابن سلول کے بیٹے عبد اللہ کو جو سچے مسلمان تھے۔ جب یہ معلوم ہوا تو تلوار سونت لی اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ کہا خدا کی قسم جب تک تم یہ الفاظ واپس نہ لو گے یعنی اپنے آپ کو ذلیل اور محمد رسول اللہؐ کو معزز نہیں کہو گے میں تمہیں مدینہ میں داخل نہ ہونے دوں گا چنانچہ اس نے ایسا کہا اور پھر رسول اللہؐ کی اجازت سے اسے مدینہ میں داخل ہونے دیا گیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ وطنی قبیلوی، اور نسلی عصبیت کی بنیادوں پر مسلمانوں کی تنظیم کسی حال میں جائز نہیں، اور ان کی تنظیم صرف اسلام کی اساس پر ہی ہو سکتی ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ابو ذر غفاریؓ نے کسی شخص کو اس کی ماں کا طعنہ دیا۔ تو آنحضرت صلعم سُنکر سخت رنجیدہ خاطر ہوئے اور فرمایا۔

انک امرءٌ فیک جاھلیۃٌ (بخاری) تجھ میں اب تک جاہلیت کی خو باقی ہے۔

اسی طرح صدیق اکبرؓ نے کہیں ایسی ہی بات کہدی تو آپ نے فرمایا۔

او فعلت وانت صدیقٌ (بخاری) صدیق ہو کر ایسی بات؟

اسلام کا تصورِ آزادی

جب آزادی کا لفظ بولا جاتا ہے تو ضروری نہیں کہ ہندوستان کا ہر باشندہ اس لفظ سے ایک ہی مفہوم مراد لے ایک لفظ آزادی کی کیا خصوصیت ہے ہر ایسی اصطلاح کے محل استعمال اور مواقع صدق میں غیر معمولی اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً عدم تشدد، ترک موالات اور اس قسم کی تمام جدید اصطلاحات میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر دوسری اقوام سے بالکل مختلف ہے مسلم غیر مسلم سوال سے قطع نظر غیر مسلم اقوام کے افراد بھی ان الفاظ کے معنی و مصداق پر متفق نہیں۔

ترک موالات کی اصطلاح دراصل قرآنی آیات سے ماخوذ ہے۔ اسلئے اس کے مصداق کے تعین کے لئے قرآنی نظریۂ اجتماع کے ماتحت ہی ایک دائرہ عمل متعین کیا جاسکتا ہے اور غیر مسلم اقوام اس کے استعمال میں قرآنی حدود کی پابند نہیں ہوسکتیں۔ زیادہ سے زیادہ ایک جزوی تصور دونوں قوموں میں مابہ الاشتراک ہوسکتا ہے۔ جو ان میں کامل اتحاد و یک جہتی پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

اسی طرح آزادی کے منشاء و مصداق میں مسلم اور غیر مسلم بالکل جداگانہ نقطہ ہائے نظر رکھتے ہیں۔ ہاں آزادی کا وہ مفہوم جو بادی النظر طریق پر سمجھا جاتا ہے یعنی استخلاص وطن یا خالص وطنی حکومت کا قیام۔ تو یہ محض سطحی نظر رکھنے والوں کے لئے کافی ہوسکتا ہے درحقیقت آزادی اپنے منشاء کے اعتبار سے اس سطحی مفہوم سے بہت بلند ہے۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ غیر ملکی حکومت کا اخراج یا قومی و ملکی حکومت نیشنل اسٹیٹ کا قیام ہی

مقصود بالذات ہے یا یہ اصل مقصد کے لئے محض وسیلہ ہے اور منتہائے مقصود کوئی دوسری چیز ہے۔ یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کے سمجھنے سے تمام فرقہ وارانہ نزاعات ایک ہی دن میں ختم ہو سکتے ہیں۔

غیر مسلموں کا مفہوم آزادی

کانگریس یا ہندو قوم نے آزادی کا ایک گھٹیا سا مفہوم متعین کر لیا ہے جو اقوامِ مغرب کے تصورِ آزادی کا عکس ہے، اور اب وہ تمام اقوامِ ہند پر اس مہمل تصورِ آزادی کو ٹھونسنا چاہتی ہے اور بدقسمتی سے کچھ مسلم اربابِ سیاست بھی اس میدان میں کانگریس کے شانہ بہ شانہ دوڑے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے ذہن و دماغ بھی اس سطحی آزادی سے آگے کسی منزل کا مشاہدہ نہیں کرتے اس لئے وہ اسی کو آخری قرار دے رہے ہیں۔

ہندو کے نزدیک آزادی کا تصور صرف یہ ہے کہ ملک کی زمامِ اختیار و اقتدار غیر ملکی ہاتھوں سے نکل کر اہلِ ملک کے ہاتھوں میں آجائے مرکز میں ایک وحدانی قسم کی حکومت قائم ہو جائے جس میں اقلیتوں (میناریٹیز) کو تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی حاصل ہو مگر اصل اقتدارِ حکومت ملک کی اکثریت (مجارٹی) کو حاصل ہو۔ اکثریت و اغلبیت کے تمام فیصلے قانون بن کر اقلیتوں کی گردن پر مسلط ہوں ملک کی پیداوار باہر نہ جائے۔ ہندوستانیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے روٹی اور تن ڈھکنے کے لئے کپڑا میسر آسکے بس کانگریس کے نزدیک آزادی کی آخری منزل یہی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آزادی کو حقیقی آزادی کا نام دیا جا سکتا ہے؟

اس سے قطع نظر کہ یہ آزادی صرف ہندو قوم کی آزادی ہوگی اور دوسری قومیں حکومت کے حقیقی اقتدار سے قطعی طور پر محروم ہوں گی۔ بالفرض یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ہندو اور مسلمان کو مرکز میں مساوی اختیار حاصل ہو تو بھی یہ آزادی حقیقی آزادی نہیں ہوسکتی۔ تا وقتیکہ ملک کی تمام قوموں کے فکر و ذہن، ضمیر اور مذہب کی مکمل آزادی کا تحقق نہ ہو ظاہر ہے کہ ہر قوم کی فکری اور ذہنی آزادی حقیقی صرف اس صورت میں محقق ہوسکتی ہے کہ اس کے لئے بالکل آزاد، خودمختار اور جداگانہ مرکز اور ایسا ماحول ہو جو اس کے طبعی مقتضیات سے مناسبت تامہ رکھتا ہو۔ کسی مخلوط سنٹر میں یہ مناسبت کسی صورت میں متصور نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ مسلمانوں کے طبعی مقتضیات اور ہندو کے فطری دواعی میں کلی تضاد ہے۔ جب تک ان متضاد عناصر ترکیبی میں کسر یعنی شکست و ریخت کا عمل نہ کیا جائے۔ اس وقت تک کسی صورت میں یہ ترکیب طبعی ترکیب نہیں کہلا سکتی اور ہر عنصر کو اگر اس کی مخصوص طبیعت پر رکھنا منظور ہے تو اس کے لئے بالکل الگ مقام و موقف تجویز کرنا ہوگا۔

مسلمان کی آزادی

مسلمان اپنی ہیئتِ اجتماعیہ کے اعتبار سے ایک مستقل بالذات قومی تشخص رکھتے ہیں اور ان کے اس اجتماعی وجود کے مخصوص تقاضے ہیں۔ جن کی تکمیل صرف مسلمان ہی کرسکتا ہے۔ کوئی دوسری قومیت و جنسیت اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے اس سے کسی قسم کا مستقل تعاون یا اتحاد نہیں کرسکتی تا وقتیکہ وہ اپنے مستقل وجود اور امتیازی خصوصیات کو مٹا کر مسلمانوں کی وحدت عمومی میں

شامل نہ ہو جائے۔ اور نہ ہی اسلامی وحدت کسی دوسری جنسیت کو اپنے اندر لینے کی مجاز ہے اور مسلم قوم بھی اپنے شعائر خصوصی کے ساتھ کسی دوسری قوم کا جزو نہیں بن سکتی۔ تا وقتیکہ وہ اپنے اجتماعی مقتضیات کو ترک نہ کر دے اور جب یہ اپنے اجتماعی تشخص کو چھوڑ دیگی۔ تو اس کے ساتھ ہی اسے مسلم کا لیبل بھی ترک کرنا ہوگا اور اپنے لئے کوئی دوسرا لیبل تجویز کرنا پڑیگا۔ کیونکہ مسلم کا نام اسی وقت تک اس پر صادق آسکتا ہے۔ جب تک یہ اپنی مخصوص ہئیت ملی کے تمام تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا ادخلوا فی السلم کافۃ ولا تتبعوا خطوات الشیطان (آیۃ)	اے ایمان والو مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر ہرگز نہ چلو۔

اسلامی نظریۂ حیات میں ربط و تسلسل قائم رکھنا اور زندگی کے تمام پہلوؤں پر ان کو منطبق کرنا مسلمان کا ملی شعار ہے اسی سے اس کے اجتماعی وجود کو بقاء حاصل ہے اس سے قطع نظر کرنے کے بعد مسلم کا کوئی وجود متحقق نہیں ہے۔

اسلام میں تنظیم (آرگنائزیشن) کے اصول و مبادی، جہاد حریت کے تقاضے معاشی نقطہ ہائے نظر اور سیاسی نظریئے اپنی خصوصیات کے لحاظ سے بالکل جدا ہیں اور کسی دوسری قوم کے نظریۂ ہائے اجتماع و تمدن کو ان سے کوئی نسبت نہیں لہٰذا مسلمان کی مطلوبہ آزادی وہی ہو سکتی ہے جو متذکرہ امور کی جامع ہو۔ دوسری اقوام کے تنظیمی، اقتصادی اور سیاسی نظریئے اسلامی نظریۂ حیات کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔

راحت مشترقتہ ورحت مغربا

شتان بین مشرق ومغرب

جو چیز ہندو قوم کے پولٹیکل جدوجہد کا آخری نقطہ بن سکتی ہے۔ وہ مسلمان کے جولانِ قدم کی ابتدائی منزل ہے۔ ان کی انتہا ایک محدود خطۂ ارضی میں رہنے والوں کے چند مادی تقاضوں کی تکمیل ہے اور ہماری انتہا تمام کرۂ ارضی میں قرآنی نظام فکر وعمل کا قیام ونفاذ ہے۔ اندھیرے میں بھٹکنے والوں کا ہاتھ جس چیز پر جا پڑا۔ اسی کو قبلۂ مقصود تصور کر لیا۔ مگر اپنے نورِ بصیرت سے کائناتِ عالم کو منور کرنے والا مردِ مومن راستہ کے سنگ میل کو کبھی منزلِ مقصود نہیں تصور کر سکتا۔

کراست آنکہ بر دانۂ افتادہ زناک، آنکہ گیرد خوش از دانۂ پروین گراست

لہذا ہر ایسی ترکیب نہ صرف غیر مفید بلکہ سخت مضر ہوگی جو ان مختلف النامیت عناصر پر مشتمل ہو۔ ایک شخص مشرق کی جانب بڑھ رہا ہے اور دوسرا مغرب کی طرف سرپٹ دوڑ رہا ہے تو کوئی یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ دونوں شخص آپس میں کسی مقام پر بغلگیر ہونگے جن دو قوموں کی راہِ عمل جدا جدا اور منزلِ مقصود الگ الگ ہے ان کی رفاقت کیسے ممکن ہو سکتی ہے۔ لہذا ہر قوم کا فطری اقتضا یہی ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ایک "مستقل واحدہ" کی حیثیت سے اپنے اجتماعی اور ملی مقتضیات کی تکمیل کرے۔ اس مقصد کے لئے اسے آزاد ماحول اور مستقل بالذات مرکز کی ضرورت ہے۔

مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ وہ اپنی مخصوص ہیئت اجتماعیہ کو ہر حال میں

برقرار رکھیں دینی اور ملی تقاضوں کو پورا کریں اور اسلام کے فلسفۂ اجتماع ضابطۂ اخلاق و تمدن نظامِ اقتصاد و معشیت اور دستورِ سیاست کا اس کی اصل شکل میں نفاذ کریں اسی صورت میں مسلم قوم کی حقیقی آزادی متصور ہوسکتی ہے اور اس کے سوا جو آزادی ہوگی وہ اسلام اور مسلم کی آزادی نہیں دین و مذہب اور روح وضمیر کی آزادی نہیں بلکہ محض ملک و وطن کی آزادی ہے جو مسلمان کے لئے ہرگز مقصود بالذات نہیں مسلمان آزادیٔ وطن کو اپنی جد و جہد کا مرکز قرار نہیں دے سکتا۔ رنگ و نسل اور قبیلوی عصبیت اس کو جہاد و قتال پر آمادہ نہیں کرسکتی۔ اس کو جنگ کے لئے ابھارنے والی صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے خدا کے مقدس دین کی سربلندی اور فتنہ و شر کا استیصال !

صرف خدا کی محبت میں تلوار اٹھانے والا مردِ غازی وطنیت اور قومیت کو ہرگز کعبۂ مقصود نہیں بنا سکتا اور اس کا دل صرف جلال خداوندی کا نشیمن ہے اس لئے وہ خدائے قہار کے سوا کسی بڑی سے بڑی چیز کے سامنے بھی اپنا سرِ نیاز خم نہیں کرتا۔

اُمرت اَنْ اسلم لرب العٰلمین

استقلال مرکز

توحید و رسالت کی طرح یہ بات بھی آج تک مسلم چلی آتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے ہر حال میں جداگانہ اور مستقل بالذات مرکز کی ضرورت ہے یعنی کسی سرزمین میں مسلمان تھوڑی سے تھوڑی تعداد میں ہیں یا بھاری اکثریت میں ان کو قوتِ مقتدرہ حاصل ہے یا نہیں بہرصورت ان کی مرکزیت الگ رہے گی

نیز مسلمانوں کی جو جماعت اقتدار ملکی اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے وہ جد و جہد کی تعبوری منزلوں میں بھی بالکل الگ اور مستقل مرکز کے ماتحت اپنی تگ و دو جاری رکھے گی. کیونکہ آج جو جماعت اقتدار حکومت کے لئے سعی کر رہی ہے. کل وہی مسند اقتدار پر متمکن ہو گی اور اب تک جو مرکزیت حصول اقتدار کا ذریعہ ہے آئندہ چل کر وہی اقتدار حاکمیت کی مالک ہو گی۔

یہ اسلامی مرکزیت جو احکم الحاکمین کے اقتدار اعلیٰ کی تابع ہے کسی دوسری انسانی مرکزیت کے لئے متبوع تو بن سکتی ہے. لیکن تابع نہیں بن سکتی اور نہ ہی مساویانہ رنگ میں کسی ایسے مرکز سے تعاون کر سکتی ہے. کیونکہ موخر الذکر دونوں صورتیں غلبۂ کفر پر منتج ہوتی ہیں اور مسلمانوں کے جہاد ملی کا مقصد اعلیٰ غلبہ کفر (فتنہ) کو ختم کرنا ہے۔

قاتلوهم حتیٰ لا تکون فتنة ویکون الدین کله لله (آیہ)	مسلمانو! تم اس وقت تک جہاد کرتے جاؤ جب تک کہ فتنہ (غلبۂ شرک) ختم نہ ہو اور اطاعت صرف اللہ کے لئے مخصوص ہو جائے

آنحضرت صلعم اور صحابۂ کبارؓ نے "فتنہ" کے مفہوم کو خود متعین فرما دیا ہے

انما کان محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقاتل المشرکین وکان الدخول فی دینهم فتنة ولیس کقتالکم علی الملك (بخاری)	آنحضرت صلعم مشرکین سے جہاد اس لئے کرتے تھے کہ ان کے دین میں داخل ہونا (غلبۂ کفر و شرک) فتنہ تھا اور وہ تمہاری طرح ملک کی خاطر نہیں لڑتے تھے۔

اس مسئلہ پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "شرح سیر کبیر" کی ایک عبارت

کے ضمن میں لکھا ہے:۔

کفار کے ساتھ ایسے معاملات میں شرکت کی شرط یہ ہے کہ وہ ہمارے تابع ہوں، اگر وہ ہمارے تابع نہ ہوں خواہ متبوع ہوں یا دونوں برابر ہوں، تو شرکت جائز نہیں، جس کی وجہ بھی اسی (مذکورہ بالا) روایت ہی میں مذکور ہے کہ شرکت میں اندیشہ یہ ہے۔ کہ جب مجموعی قوت سے ان کا مقابل مغلوب ہو جائے پھر وہ اپنی قوت سے مسلمانوں کو مغلوب کر سکتے ہیں

اب اگر مسلمان اسی غیر مسلم طالب آزادی جماعت (کانگریس) کے ساتھ شریک ہو جائیں تو یقیناً وہ مسلمانوں کے تابع نہیں ہیں۔ بلکہ یا تو متبوع ہوں گے۔ اور مسلمان ان کے تابع اور غالب یہی ہے۔ اور یا دونوں برابر ہوں گے۔ تو گویا یہ احتمال بہت ضعیف ہے۔ لیکن اگر ایسا ہو بھی تب بھی جواز شرکت کی جو شرط تھی کہ مسلمان متبوع ہوں وہ مفقود ہے اس لئے جواز بھی مفقود ہے اور جو وجہ عدم شرکت کی روایت مذکورہ میں بیان کی گئی ہے۔ کہ مسلمانوں سے کام نکال کر پھر خود مسلمانوں پر غالب آنے کی کوشش کریں۔ یہاں اس کا خطرہ یقینی ہے

(اشرف السوانح حصہ سوم ص۲۰۲)

یہ تو ہے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ! مگر اس سے قطع نظر

یہ اسلام کی ایسی بیّن حقیقت ہے کہ اس کے ثبوت کے لئے قطعاً کسی استدلال کی ضرورت نہیں مگر ہماری بدبختی کی بھی حد ہو گئی ہے کہ آج ہمیں شریعتِ حقّہ کے بدیہی اور مسلّمہ مسائل کے لئے بھی دلائل و براہین کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

بسے نادیدنی را دیدہ ام من
مرا اے کاشکے مادر نہ زادے (اقبال)

زمانۂ رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں کوئی ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ مسلمانوں نے بدرجۂ اقل مساوی حیثیت سے ہی غیر مسلموں سے اشتراکِ عمل کیا ہو، اگر کیا ہے، تو صرف متبوع کی حیثیت سے! اس سلسلہ میں کتاب و سنت سے بے شمار شہادتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر یہ ایک مستقل بحث ہے، اور کسی آئندہ فرصت میں ہم اسے چھیڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بہرحال مسلمانوں کا مخصوص نظام مرکزیت ان کو ایک لمحہ کے لئے بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی دوسری مرکزیت کو اسلامی مرکزیت پر مسلّط کر دیں۔ یا دوسری مرکزیت سے جوڑ توڑ کر کے کوئی درمیانی راستہ تجویز کریں بلکہ ان کو ہر حال میں ایک ایسے الگ اور مستقل مرکز کے ماتحت رہنا لازمی ہے۔ جو اسلامی نظام مرکزیت کا تابع ہو۔

اسلامی نظام مرکزیت ان ہی خصوصیات کے اعتبار سے بالکل جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ اور یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے۔

جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، اس لئے چند اشارات پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اس باب میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے لئے مرکز اطاعت کا تعین ہو، اس بارے میں قرآن کریم کی نص قطعی موجود ہے کہ مسلمانوں کا مرکز اطاعت خدا، رسول اور امیر ہے

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم ؎	اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسول اور تم میں سے ہی جو امیر ہو اس کی اطاعت کرو

؎ "امر" کا لفظ بالعموم کتاب وسنت میں حکومت و اقتدار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً "انا لاؤلی ھذ الامر" اور "ان لا تنازع الامر اھلہ" اور اس طرح کی بے شمار احادیث ہیں امر کے یہی معنی لئے گئے ہیں۔ اس لئے "اولی الامر" سے مراد خلیفہ و امیر ہی ہو سکتا ہے۔ اگرچہ بالتبع آئمہ و مجتہدین بھی اس میں شامل ہیں۔

امام بخاری نے متذکرہ بالا آیت کو باب کا عنوان قرار دیا ہے اور اس کے ماتحت یہ روایت درج کی ہے

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی	جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی

روایت کے مفہوم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت دراصل خدا اور رسول کی اطاعت ہے اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ مسلمانوں کا ایک مستقل مرکز ہو جو رب العالمین کے اقتدار اعلیٰ کا تابع ہو کسی غیر اسلامی مرکز میں یہ خصوصیت قطعًا نہیں پائی جا سکتی۔

اطاعت امیر کے بارے میں اس کثرت سے احادیث و آثار وارد ہیں کہ توحید و رسالت کو چھوڑ کر کسی دوسرے دینی مسئلہ کے متعلق بہت کم ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی وحدتِ ملی کے تحفظ و بقا کے لئے خلیفہ و امیر کا وجود ناگزیر ہے کیونکہ فکر و عمل کا اتحاد اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جبکہ پوری جماعت کا ایک ہی مرکزِ اطاعت ہو اور افرادِ جماعت دائرہ ملکیہ کی طرح اپنے نقطۂ مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہوں فکر و خیال میں اتحاد و تسلسل ہو اور عملی جد و جہد میں نظم و انضباط! ہر قدم پوری ہم آہنگی اور یک جہتی کے ساتھ اٹھے۔

امیر کا وجود دراصل ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ذریعہ پوری قوم دشمن کے حملہ و ہجوم سے محفوظ رہتی ہے۔ یہی فلسفہ جماعت محمد عربی صلعم کے بلیغ کلام میں ملتا ہے۔

انما الامام جُنّةٌ یقاتل من وراءہ و یُتّقی بہ (مسلم)	امام یا امیر ایک ڈھال ہے جس کی پناہ لے کر جہاد و قتال کیا جاتا ہے

(از حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۵۲۶)

جماعت میں نظری اور فکری اتحاد کے علاوہ اس کا ہر عمل بندھا

اور سمٹا ہوا ہونا چاہیئے اور اس میں کسی قسم کا انتشار نہ ہو۔ بالکل ایسا معلوم ہو کہ جماعت کے افراد ایک ہی جسم کے اعضاء ہیں یا ایک ہی تنے کی شاخیں، پھول اور پتے ہیں جو بہارِ زندگی سے ہم کنار ہو رہے ہیں

ملت کے ساتھ رابطۂ استوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

دل و دماغ الگ الگ ہوتے ہوئے طریقِ فکر ایک ہو۔ آنکھیں جدا جدا رکھنے کے باوجود طرزِ نگاہ میں کوئی اختلاف نہ ہو

چیست ملت ایکہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ (اقبال)

اسلامی زندگی بس جماعتی زندگی کا دوسرا نام ہے اور انفرادیت حیاتِ جاہلی کی مرادف ہے۔

عن ابن عباسؓ من رأی من امیرہ شیئاً یکرھہ فالیصبر فانہ لیس احد یفارق الجماعۃ شبراً فمات مات میتۃً جاھلیۃً	جو شخص امیر سے کوئی ناپسندیدہ حرکت دیکھے تو اسے صبر کرنا چاہیئے۔ کیونکہ جو شخص جماعت سے الگ ہو کر مرا اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی

(متفق علیہ)

دائرہ اطاعت

اطاعت امیر کے سلسلہ میں ایک اہم بحث کی تنقیح بھی ضروری ہے کہ اس باب میں مسلمانوں نے اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کو کچھ اس طرح

خلط ملط کر دیا ہے کہ اسلام کے صحیح تصورِ اطاعت کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، بالخصوص ہندوستان کے نازیت زدہ اشخاص نے اطاعتِ امیر کی اصل سپرٹ کو سمجھا ہی نہیں جس کی وجہ سے وہ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

دراصل اسلام میں اطاعت امیر ایک مذہبی فریضہ کی حیثیت رکھتی ہے اور اسلام نے جہاں پوری زندگی کی حدیں متعین کر دی ہیں وہاں اطاعت کو بھی ایک خاص دائرہ عمل میں محدود کر دیا ہے۔ لہٰذا اس مذہبی فریضہ کی تکمیل کتاب و سنت کے متعین حدود کے اندر ہی ہو سکتی ہے۔ اور مسلمان ہر چیز کے حسن و قبح کو اسی عینک سے دیکھتا ہے۔ اس لئے اس کا ہر قدم اسلام کے حدود کے اندر رہ کر ہی اٹھ سکتا ہے۔ اور امیر کا حکم بھی اسی پابندی کے ساتھ سنا اور مانا جا سکتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ امیر کتاب و سنت کے خلاف حکم دے اور مسلمان اندھا دھند اسے اطاعت امیر تصور کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے اور خدا و رسول کے نزدیک مجرم قرار پائے۔

اس باب میں اسلام کا واضح حکم یہ ہے کہ کسی ایسی بات میں مخلوق کی اطاعت نہیں کی جا سکتی جس میں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو۔

لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق

لہٰذا اسلام میں اطاعت کا لزوم صرف ان احکام تک ہی محدود ہے جو کتاب و سنت سے متصادم نہ ہوں۔ جو لوگ اسلامی تعلیمات کی اصل روح

کو سمجھتے ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اسلام میں سب سے اہم فرض امر بالمعروف ہے جو کسی حال نظر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس کی تائید میں عہدِ نبوت کے بہت سے واقعات کتب صحاح سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے اسلامی فوج کا ایک دستہ خالد بن ولید کی سرکردگی میں بنی حذیفہ کی طرف بھیجا انہوں نے جا کر اس قبیلہ کو اسلام کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے قبولِ دعوت سے انکار کر دیا، اب خالدؓ نے کچھ لوگوں کو قتل کیا اور دوسروں کو گرفتار کر کے اپنے سپاہیوں کی تحویل میں دے دیا اور اس کے بعد حکم دیا کہ تم اپنے اپنے اسیر کو قتل کر دو' اس پر عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا 'واللہ میں تو اپنے قیدی کو ہرگز قتل نہ کروں گا اور نہ ہی میرے ساتھی یہ حرکت کرنے کو تیار ہیں۔ واپسی پر یہ معاملہ سردارِ دو جہاں صلعم کے حضور میں پیش ہوا۔ آپؐ نے سن کر ارشاد فرمایا :-

اللھم انی ابرء الیک مما صنع خالدؓ (بخاری کتاب المغازی) — اے خدا میں خالد کے اس فعل سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں

رسول خدا صلعم نے ایک انصاری کی قیادت میں فوج کا ایک دستہ روانہ کیا۔ اور حکم دیا کہ امیر کی اطاعت کرنا۔ اس دستہ فوج نے منزلِ مقصود کی طرف رُخ کیا سفر کے کسی مرحلہ پر امیر کسی بات سے ناراض ہو گیا اور اپنی سپاہ کو ان الفاظ سے مخاطب کیا" کیا رسول اللہ صلعم نے

تمہیں میری اطاعت کا حکم نہیں دیا"؟ سب نے یک زبان ہو کر جواب دیا "ہاں" کہا تم سب لکڑیاں جمع کرو، لکڑیاں اکٹھی کر دی گئیں تو حکم دیا کہ ان کو آگ لگادو۔ آگ بھی لگا دی گئی تو کہا اس میں چھلانگ لگادو۔ اس پر بہت سے لوگ آگ میں کود پڑنے کو بھی تیار ہو گئے، مگر ان میں اصحاب بھی موجود تھے جو اسلام کے تصور اطاعت کو سمجھتے تھے، انہوں نے کہا ہم نے اس آگ سے بچنے کے لئے ہی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن پکڑا ہے، ہم ایسا ہرگز نہ کریں گے۔ جب آنحضرت صلعم تک یہ بات پہنچی تو فرمایا "اگر تم لوگ آگ میں چھلانگ لگاتے تو قیامت تک اس سے نہ نکل سکتے" اور فرمایا کہ

الطاعۃ فی المعروف (بخاری)	اطاعت صرف نیک کام میں ہی ہو سکتی ہے۔

حکیم عبدالخالق خلیق نے منظور عام مدنی پریس میں چھپوا کر ادارہ اشاعت سرحد پشاور سے شائع کیا

اسلامی نظریۂ اجتماع

از

حیدر زمان صدیقی

ادارۂ اشاعت سرحد پشاور

قیمت مجلد:- تین روپے (ہے)